سیرتِ ائمہؒ اربعہ

نظر ثانی اور اضافے کے بعد

حضرت امام ابو حنیفہؒ

حضرت امام شافعیؒ

حضرت امام مالکؒ

حضرت امام احمد بن حنبلؒ

کی

مکمل و مستند احوال و سوانح

مرتبہ

سیّد رئیس احمد جعفری

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور حیدر آباد کراچی

سیرتِ ائمۂ اربعہؒ

یعنی

• حضرت امام ابو حنیفہؒ • حضرت امام شافعیؒ
• حضرت امام مالکؒ • حضرت امام احمد بن حنبلؒ

کی

مکمل و مُستند احوال و سوانح

نظرِ ثانی اور اضافے کے بعد

مرتبہ

سید رئیس احمد جعفری

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

مضامین	صفحہ
امام صاحب کے شاگرد جو محدث وقت تھے۔	۲۰۴
امام صاحب کے وہ شاگرد جو فقہ کے امام بنے۔	۲۱۰
امام مالکؒ	۲۲۱
خصوصیات	۲۲۲
ولادت، طفولیت، خاندان	۲۲۳
تعلیم، تربیت، تفقہ، تکمیل، حدیث	۲۲۵
شغل درس وتدریس، شان ورفعت	۲۴۳
امام صاحب کے شاگرد اور حلقہ مستفیدین	۲۵۰
امام مالک ایک فقیہ اور مفتی کی حیثیت سے	۲۵۶
امام صاحب کے فضل وکمال کا اعتراف	۲۶۴
شغل حیات، شخصیت اور عظمت	۲۶۶
سفر آخرت	۲۸۰
اخلاق وکردار، ذاتی زندگی	۲۸۴
امام صاحب کی تصنیفات وتالیفات کا اجمالی ذکر	۲۹۱
مؤطا امام مالک — اصح الکتب بعد کتاب اللہ	۲۹۴
مؤطا کی شروح، تجریدیں، اسناد، رجال وغیرہ	۳۰۸
امام شافعیؒ	۳۱۵
خصوصیات	۳۱۶

مضامین	صفحہ
ولادت، عہدِ طفولیت، تربیت	۳۱۷
تعلیم، شیوخ اور اساتذہ، جامع علوم وفنون	۳۲۱
امام شافعی کی گرفتاری اور رہائی، ہارون رشید کی غلط فہمی	۳۳۰
شانِ استغنا، جلالی علم، وقار وتمکین، عزیمت واستقامت	۳۳۴
امام شافعی کی فن مناظرہ میں دستگاہ	۳۴۷
امام شافعی کی شکل وشباہت، اولاد وازدواج	۳۵۷
امام صاحب کے تلامذہ اور شاگرد	۳۵۵
امام صاحب کی روحانی منزلت	۳۶۴
امام صاحب کی تصانیف نافعہ	۳۶۹
امام صاحب کے شیوخ واساتذہ کا مختصر تذکرہ	۳۷۳
کچھ فقہ، تفقہ واجتہاد کے بارے میں	۳۸۳
قرآن، فہم قرآن، تفسیر قرآن اور امام شافعی	۴۰۲
حدیث کی بحث، اصطلاحیں، درجے۔	۴۱۷
احادیث اگر آپس میں معارض ہوں تو کیا کیا جائے؟	۴۳۳
حدیث کے ظاہر معنی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا	۴۴۱
جلب منفعت اور دفع مضرت	۴۴۴
متعارض احادیث کے راویوں کی جرح وتعدیل	۴۴۸
حدیث قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی	۴۵۴
ہر کلیہ میں استثنا ضروری ہے	۴۵۶
حدیث صحیح اور اقوال صحابہ	۴۵۸

مضامین	صفحہ
صحیح حدیث پر عمل لازمی ہے	۴۵۹
فقہ، اصول فقہ، مذاہب فقہ	۴۶۲
مذہب حنفی	۴۶۸
فقہ مالکی	۴۷۳
امام شافعی کا طرزِ اجتہاد اور اصول فقہ	۴۷۵
امام شافعی کے اقوال و کلمات	۴۸۳
امام صاحب کا کمال نظم و نثر	۴۸۵
امام شافعی شاہ ولی اللہ کی نظر میں	۵۰۱
امام شافعی کے دو باکمال شاگرد	۵۰۸
وفات حسرت آیات	۵۱۰
وفات کے بعد مبشرات	۵۱۶
امام احمدؒ بن حنبلؒ	۲۱۹
خصوصیات	۵۲۰
ولادت و طفولیت نسب اور خاندان	۵۲۱
شوق علم، تحصیل علم، ذوق علم	۵۲۳
امام احمد بن حنبلؒ کے اساتذہ	۵۲۶
امام صاحب کے شاگرد اور تلامذہ	۵۲۷
زہد و تقویٰ، نیکی اور پارسائی، اسلامیت اور للہیت	۵۲۹
فتنۂ خلق قرآن	۵۳۷

مضامین	صفحہ
عالم اسلام کا خراج تحسین و عقیدت	۵۴۸
ملوکیت سے ٹکرّ اور اس کا ردِّ عمل	۵۵۱
امام صاحب کا عقیدہ	۵۵۸
امام احمد بن حنبلؒ کے مصنفات و مولفات	۵۶۷
تمت بالخیر	۵۷۰
امام احمد بن حنبل کی شخصیت پر ایک نظر	۵۷۴
مبشرات	۵۸۳

امام ابوحنیفہؒ

ولادت ؁۸۰ھ

وفات ؁۱۵۰ھ

خصوصیات

- تابعی تھے
- عالم، محدث، فقیہ، عابد، زاہد تھے
- محب اہل بیت تھے اور اس سلسلہ میں بڑی تکلیفیں وقت کی حکومت کے ہاتھوں اٹھائیں۔
- امام مالک سے عمر میں بڑے تھے لیکن ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔
- فنِ فقہ کے موجد تھے۔ یہ نہ ہوتے تو آج فقہ کا علم نہ ہوتا۔
- دولت مند تھے لیکن دریا دل، معزز تھے۔ لیکن منکسر المزاج، طاقت ور تھے لیکن متحمل۔
- حق کے مقابلہ میں حکومت کی ناخوشی مول لی۔ جیل بھیجے گئے۔ وہاں جب روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تب رہائی ملی۔
- تقریباً تمام اسلامی حکومتوں کا مذہب حنفی رہا۔ عالم اسلام کی غیر معمولی اکثریت حنفی ہے۔
- امام جعفر صادقؒ کے اجل تلامذہ میں تھے۔

نام، نسب، ولادت

نعمان نام، ابو حنیفہ کنیت، امام اعظم لقب، شجرہ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ، یہ امر جیسا کہ خود ناموں کی ترکیب سے ظاہر ہے۔ عموماً مسلّم ہے کہ امام صاحب عجمی النسل تھے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کس نسل سے تھے اور عرب میں کیوں کر آئے۔ خطیب مؤرخ بغدادی نے امام کے پوتے اسمٰعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے۔ کہ میں اسمٰعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسلِ فارس سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے، ہمارے دادا ابو حنیفہ رح ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہ، کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دُعا بے اثر نہیں رہی۔[۱] اسمٰعیل نے امام صاحب کے دادا کا نام نعمان بتایا۔ اور پر دادا کا نام مرزبان، حالانکہ عام طور پر زوطی اور ماہ مشہور ہے۔ غالباً جب زوطی ایمان لائے تو ان کا نام نعمان سے بدل دیا گیا۔ اسمٰعیل نے سلسلہ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی اسلامی نام لیا اور حمیّت اسلامی کا مقتضا بھی یہی تھا۔ زوطی کے باپ کا اصلی نام غالباً کچھ اور ہوگا اور ماہ اور مرزبان لقب ہوں گے کیونکہ اسمٰعیل کی روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارس میں رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں، اسی لیے نہایت قرین قیاس ہے۔ کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں نہ کہ نام۔ درحقیقت ماہ اور مرزبان کے ایک معنی ہیں، ماہ دراصل وہی مر

---

[۱] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ترجمہ امام ابو حنیفہ ۱۲

ہے جس کے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں۔ مشہور مصرع ہے ؎

نہ کہہ را منزلت ماند نہ مہ را

عربی لہجہ نے مہ کو ماہ کر دیا۔

زوطی غلام نہ تھے

بعض مورخوں نے زوطی کی نسبت لکھا ہے کہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے اور قبیلۂ بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خریدا، کچھ دنوں غلامی میں رہے، پھر اُس نے آزاد کر دیا۔ اسی لیے امام کا خاندان مولیٰ بنی تیم اللہ کہلاتا ہے، مخالفوں نے جن کو امام کی تنقیص میں مزہ آتا ہے۔ اس روایت کو زیادہ چمکایا ہے۔ حالانکہ اس قسم کی غلامی ثابت بھی ہو تو کسرِ شان کی کیا بات ہے۔ زمانہ نے خاندانِ کسریٰ پر اس لقب کا داغ لگایا ہے۔ ہمارے علماء حضرت ہاجرہ کو کنیز تسلیم کرتے ہیں۔ (گو توریت سے ثابت نہیں) اسلام کے قریب تر زمانہ میں اکثر وہ لوگ حدیث اور روایت کے امام نظر آتے ہیں۔ جن پر اس قسم کی غلامی کا اطلاق ہو چکا تھا۔ امام حسن بصری، ابن سیرین، طاؤس، عطاء بن یسار نافع، عکرمہ مکحول جو اپنے زمانہ کے مقتدائے عالم تھے۔ خود یا اُن کے باپ دادا غلام رہ چکے تھے۔

زوطی کا غلام ہونا بھی ثابت ہو تو کچھ عار نہیں، لیکن تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ہیں، امام کے نسب میں اَور بھی اختلاف ہیں۔ ابو مطیع نے ان کو نسلِ عرب سے شمار کیا ہے۔ اور سلسلۂ نسب یوں بتاتا ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن تکئی بن زید ابن اسد بن راشد الانصاری، حافظ ابو اسحاق نے شجرۂ نسب کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے۔ نعمان بن ثابت بن کاؤس بن ہرمز بن بہرام، زوطی کے مقامِ سکونت میں بھی اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف ضرور ہونے چاہیئے تھے۔ زوطی اوّل اوّل جب عرب میں آئے ہوں گے تو برسوں تک ان کی حالت بیگانگی کی رہی ہو گی، لوگوں کو اُن کے حالات کے ساتھ چنداں اعتنا نہ ہو گا۔ اور ہو گا تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے صحیح حالات نہ معلوم ہو

سکے ہوں گے۔ معاشرت کی ضرورتوں نے زوطی کو مجبور کیا ہوگا۔ کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلق پیدا کریں۔ یہ طریقہ عرب میں عام طور پر جاری تھا اور اس قسم کے تعلق کو ولاء کہتے تھے۔ جس کا مشتق مولا ہے۔ مولا غلام کو بھی کہتے ہیں اسی طرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطی کو غلام سمجھ لیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل پکڑ کر کسی قدر عام ہوگیا جس کی وجہ سے اسمٰعیل کو واضح کرنا پڑا کہ واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا۔ اسمٰعیل نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے اس وجہ سے دقیقہ سنج مؤرخوں نے اس بحث میں انہی کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ کہ صاحب البیت اوری ابما فیھا قاضی صیمری نے جو بڑے پایہ کے مصنف ہیں صاف تصریح کی ہے کہ زوطی بنی تیم اللہ کے حلیف یعنی ہم قسم[1] تھے۔" اس روایت کا جس میں زوطی کی غلامی کا ذکر ہے) یہ قصہ بھی غلط ہے کہ وہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے زوطی کے باپ دادا کے نام فارسی زبان کے ہیں، خود امام ابوحنیفہ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ خاندانی حیثیت سے فارسی زبان جانتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کابل کی زبان فارسی نہ تھی

اصل وطن کہاں تھا؟

زوطی کی نسبت ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے مورخوں نے مختلف شہروں کے نام لئے، جن میں سے کسی کی نسبت ترجیح کا دعوےٰ نہیں کیا جاسکتا۔ یقینی طور پر جو ثابت ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اقلیم فارس اور فارسی نسل سے تھے' یہ ممالک اس زمانہ میں اسلامی اثر سے معمور تھے اور اکثر بڑے بڑے خاندان اسلام قبول کرتے جاتے تھے، غالباً زوطی اسی زمانہ میں اسلام لائے اور جوش شوق یا خاندان والوں کی ناراضی

---

[1] دیکھو قلائد عقود العقیان باب اول علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مولیٰ کا لفظ زیادہ تر حلیف ہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

سے جس کا سبب تبدیلِ مذہب تھا، عرب کا رُخ کیا یہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور شہر کوفہ دار الخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ اس تعلق سے زوطی نے کوفہ کو پسند کیا اور وہیں سکونت اختیار کی، کبھی کبھی جناب امیرؓ کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص و عقیدت کے ساتھ آداب بجالاتے۔ ایک بار نوروز کے دن کہ پارسیوں کی عید کا دن ہے، فالودہ نذر کے طور پر بھیجا، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ نوروزنا کل یوم" یعنی ہمارے یہاں ہر روز نوروز ہے۔" ثابتؒ امام ابوحنیفہ کے پدر بزرگوار کوفہ ہی میں پیدا ہوئے، زوطی نے نیک فال لڑکے کو حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے بزرگانہ شفقت فرمائی اور ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔

ثابتؒ کے حالاتِ زندگی بالکل معلوم نہیں قرائن سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ تجارت کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چالیس برس کی عمر ہوئی تو خدا نے فرزند عطا کیا۔ جس کا نام والدین نے نعمان رکھا لیکن زمانہ نے آگے چل کر امام اعظم کے لقب سے پکارا۔

امام صاحب نے صحابہ کی زیارت کی تھی

اس وقت عبد الملک بن مروان جو دولتِ مروانیہ کا دوسرا تاجدار شمار کیا جاتا ہے مسند آرائے خلافت تھا، یہ وہ عہدِ مبارک تھا کہ رسول اللہ صلعم کے جمالِ مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں، ان میں سے چند بزرگ موجود تھے جن میں سے بعض امام ابوحنیفہ کے آغازِ شباب تک زندہ رہے۔ انس بن مالکؓ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم خاص تھے ۹۳ھ میں وفات پائی سہل بن سعدؓ نے ۹۱ھ میں انتقال کیا اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ تو سو ہجری تک زندہ رہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہ نے کسی سے بھی کوئی حدیث روایت

کی۔ اس پر لوگوں کو نہایت تعجب ہے۔ اور مورخوں نے اس کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں۔ بعضوں کی رائے ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس وقت تک کسی قسم کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ ان کے باپ دادا تجارت کرتے تھے۔ اس لیے ان کی نشو ونما بھی ایک عام تاجر کی حیثیت سے ہوئی۔ بڑے ہونے پر امام شعبی کی ہدایت سے علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس لئے موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یعنی صحابہ میں سے کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

کیوں روایت نہیں کی

محدثین میں باہم اختلاف ہے کہ حدیث سیکھنے کے لیئے کم از کم کیا عمر مشروط ہے؟ اس امر میں ارباب کوفہ سب سے زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ یعنی بیس برس سے کم عمر کا شخص حدیث کی درسگاہ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے نزدیک چونکہ حدیثیں بالمعنی روایات کی گئی ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ طالب علم پوری عمر کو پہنچ چکا ہو۔ ورنہ مطالب کے سمجھنے اور اس کے ادا کرنے میں غلطی کا احتمال ہے۔ غالباً یہی قید تھی۔ جس نے امام ابوحنیفہ کو ایسے بڑے شرف سے محروم رکھا اور سچ پوچھو تو یہ مصلحت سے خالی بھی نہیں۔ جن لوگوں نے دس بارہ برس کے سن میں صحابہ سے حدیثیں سنیں، ان کی روایتیں اس لحاظ سے تو قابل اعتماد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک صرف ایک واسطہ ہے۔ لیکن اس بات کا قوی احتمال موجود ہے۔ کہ کمسنی کی وجہ سے مضمون حدیث کی تمام خصوصیتیں خیال میں نہ آئی ہوں۔ جس کی وجہ سے ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

تابعیت کی بحث

بہرنوع وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے کسی صحابی سے کوئی حدیث نہیں سنی، تاہم یہ شرف ان کی قسمت میں تھا کہ جن آنکھوں نے پیغمبر کا جمال دیکھا تھا۔ ان کے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کیں۔ یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے، لیکن چونکہ اس سے تابعیت کا رتبہ حاصل

لہ مقدمہ ابن الصلاح مطبوعہ لکھنؤ ۲۵۸

ہوتا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ مذہبی پیرایہ میں آگیا ہے۔ اور اس پر بڑی بحثیں قائم ہو گئی ہیں۔ بے شبہ امام ابو حنیفہ کو اس شرف پر ناز تھا اور بجا تھا۔ کہ انہوں نے حضرت انس رضؓ صحابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، غیر قومیں ان باتوں کو معمولی امر خیال کریں گی، لیکن ان واقعات سے اس محبت اور جوشِ عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے، جو مسلمانوں کو رسول اللہؐ اور ان کے تعلق کی وجہ سے صحابہ کے ساتھ تھا سچ ہے۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا　　بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس ست

بعض لوگوں نے امام کی تابعیت سے انکار کیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے بھی لوگوں کو شبہ ہوا تھا، لیکن محدثین نے جن کو اس قسم کی بحثوں کے طے کرنے کا زیادہ حق حاصل ہے، امام کے موافق فیصلہ کیا، حافظ ابن حجر عسقلانی سے کہ فن حدیث کے ایک عنصر ہیں فتویٰ لیا گیا انہوں نے جواب لکھا۔ "امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں کئی صحابی موجود تھے۔ اس لیے کہ امام ۸۰ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے اور اس وقت وہاں صحابہ میں سے عبد اللہؓ بن ابی اوفیٰ موجود تھے۔ کیونکہ وہ ۸۲ھ میں یا اس کے بعد مرے اور ابن سعد نے روایت کی ہے۔ جس کی سند میں کچھ نقصان نہیں کہ امام ابو حنیفہ نے انسؓ بن مالک کو دیکھا تھا۔ ان دو صحابہ کے سوا اور اصحاب بھی مختلف شہروں میں موجود تھے بعض لوگوں نے ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو امام نے صحابہ سے روایت کیں۔ لیکن ان حدیثوں کی سندیں ضعف سے خالی نہیں اور صحیح یہی ہے کہ امام ان کے ہم زماں تھے اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا جیسا کہ ابن سعد نے روایت کی ہے۔ پس اس لحاظ سے امام ابو حنیفہؒ تابعین کے طبقہ میں ہیں اور یہ امر اور اماموں کی نسبت جو ان کے ہمعصر تھے مثلاً اوزاعی شام میں حماد بصرہ میں ثوری کوفہ میں، مالک مدینہ شریف میں، لیث مصر میں، ثابت نہیں ہوا واللہ اعلم[۱]۔

---

[۱] اس فتویٰ کو حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں بعبارتہا نقل کیا ہے۔ اور میں نے اسی کا (۴۴)

ابن سعد کی جس روایت کا حافظ ابن حجر نے حوالہ دیا ہے وہ صرف ایک واسطہ یعنی سیف بن جابر کے ذریعہ سے امام ابو حنیفہ تک پہنچتی ہے۔ یعنی ابن سعد نے سیف بن جابر سے سنا اور سیف نے خود امام ابو حنیفہ[1] سے۔ ابن سعد وہ شخص ہیں۔ جن کی نسبت علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ اگرچہ ان کا شیخ واقدی ثقہ نہیں مگر وہ خود نہایت ثقہ ہیں"۔ سیف بن جابر بصرہ کے قاضی اور صحیح الروایۃ تھے اس لحاظ سے یہ روایت اس قدر صحیح اور مستند ہے کہ قوی سے قوی حدیث بھی اس سے زیادہ صحیح نہیں ہو سکتی، اسی بنا پر تمام بڑے بڑے محدثین مثلاً خطیب بغدادی علامہ سمعانی مصنف کتاب الانساب علامہ نووی شارح صحیح مسلم، علامہ ذہبی حافظ ابن حجر عسقلانی زین الدین عراقی سخاوی ابو المحاسن دمشقی نے جن پر اب حدیث و روایت کا مدار ہے۔ قطعاً فیصلہ کر دیا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حضرت انس رضؓ کو دیکھا تھا[2]۔

ابن خلکان نے بھی خطیب بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لیکن چونکہ مورخ مذکور نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو کسی صحابی سے ملاقات اور روایت حاصل نہیں ہوئی۔ لوگوں کو دھوکا ہوا کہ ابن خلکان تابعیت کے منکر ہیں، حالانکہ ابن خلکان کو ملاقات اور روایت سے انکار ہے نہ رویت سے، لیکن اگر ابن خلکان کی عبارت کا وہی مطلب ہو جو بعض ظاہر بینوں نے قرار دیا ہے تاہم کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ایسے بڑے بڑے محدثین کے مقابلہ میں ان کی شہادت کچھ بھی اعتبار کے قابل ہوگی، اصول روایت میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے اثبات و نفی میں برابر درجے کی شہادتیں موجود

---

(۳۳) لفظی ترجمہ کیا ہے۔

[1] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی میں یہ تصریح موجود ہے۔

[2] مختصر تاریخ خطیب بغدادی و کتاب الانساب و تہذیب الاسماء و اللغات و تذکرۃ الحفاظ و عبر فی اخبار من غبر الذہبی تہذیب التہذیب میں امام ابو حنیفہ کا ترجمہ دیکھو۔

ہوں تو اثبات کا اعتبار ہو گا۔ یہاں نفی کی شہادت ثبوت کے مقابلہ میں بالکل کم رتبہ ہے۔

صحابہ سے روایت نہیں کی

بعض حنفیوں نے رویت سے بڑھ کر روایت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اور تعجب ہے کہ علامہ عینی شارح ہدایہ بھی اسی غلطی کے حامی ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دعوے ہرگز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ حالانکہ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں ان تمام حدیثوں کو مع سند نقل کیا ہے۔ جن کی نسبت یہ خیال ہے کہ امام نے صحابہ سے سنی تھیں۔ پھر اصول حدیث سے ان کی جانچ کی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ہرگز ثابت نہیں، محدثانہ بحثیں تو وقت طلب ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ امام نے صحابہ سے ایک بھی روایت کی ہوتی، تو سب سے پہلے امام کے تلامذۂ خاص اس کو شہرت دیتے۔ لیکن قاضی ابو یوسف، امام محمد، حافظ عبدالرزاق بن ہمام، عبداللہ بن المبارک، ابو نعیم فضل بن وکیع، مکّی بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل وغیرہ سے کہ امام کے مشہور اور با اخلاص شاگرد تھے اور سچ پوچھیے تو زیادہ تر ان ہی لوگوں نے ان کی نام آوری کے سکے بٹھائے ہیں، ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق منقول نہیں۔

کنیت کی توجیہ

امام کی کنیت جو نام سے زیادہ مشہور ہے۔ حقیقی کنیت نہیں ہے۔ امام کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہ تھا، یہ کنیت وصفی معنی کے اعتبار سے ہے یعنی ابو الملۃ الحنیفہ، قرآن مجید میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا ہے۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (آل عمران ۱۰)

(سو ابراہیم کی طریقہ کی پیروی کرو۔ جو ایک خدا کے ہو رہے تھے)۔

امام ابو حنیفہ نے اسی نسبت سے اپنی کنیت ابو حنیفہ اختیار کی۔

تحصیل علم، شیوخ اور اساتذہ

امام کے بچپن کا زمانہ نہایت پُرآشوب تھا۔ حجاج بن یوسف خلیفہ عبد الملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ اور ہر طرف ایک قیامت برپا تھی۔ چونکہ مذہبی گروہ کی مخالفت کی وجہ سے عرب و عراق میں اب تک مروانی حکومت کے پاؤں نہیں جمے تھے۔ حجاج کی سفاکیاں زیادہ تر انہی لوگوں پر مبذول تھیں، جو ائمہ مذہب اور علم و فضل کی حیثیت سے مقتدائے عالم تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے نہایت سچ کہا کہ اگر اور پیغمبروں کی اُمتیں مِل کر اپنے اپنے زمانہ کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو مقابلہ میں لائیں تو واللہ ہمارا پلّہ بھاری رہے گا۔" عبد الملک نے ۸۶ھ میں وفات کی، اور اس کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ ولید کے زمانہ میں اگرچہ فتوحات نے نہایت ترقی کی، اسپین و سندھ دو بڑی مملکتیں اسلام کے قبضہ میں آگئیں، خوارزم و سمرقند سے گذر کر کابل و فرغانہ پر علم اسلام لہرانے لگا۔ اسپین کی طرف جزائر منورقہ و میورقہ فتح ہوئے۔ لیکن اسلام کی روحانی برکتوں کا نشان نہ تھا۔ عہدہ داروں میں سے جو لوگ جس قدر زیادہ معزز اور باوقار تھے۔ اسی قدر ظالم اور سفاک تھے۔ اسی زمانہ کی نسبت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرمایا کرتے تھے۔ کہ ولید شام میں حجاج عراق میں عثمان حجاز میں، قرہ مصر میں، واللہ تمام دنیا ظلم سے بھر گئی"۔ اس عالمگیر آشوب میں بھی اگرچہ درس و تعلیم کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا، جابجا حدیث و روایت کی درسگاہیں موجود تھیں اور فقہا و محدثین باوجود بے اطمینانی کے درس و تدریس میں مشغول تھے۔ تاہم اسلام کی حوصلہ مندیوں اور جوش کے لحاظ سے جس قدر تھا نہایت

کم تھا۔

عمر بن عبدالعزیز کا مبارک دور

ملک کی خوش قسمتی تھی۔ کہ حجاج ۹۵ھ میں مر گیا، ولید نے بھی ۹۶ھ میں وفات پائی۔ ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک نے مسندِ خلافت کو زینت دی، جس کی نسبت مؤرخین کا بیان ہے۔ کہ خلفائے بنو امیہ میں سب سے افضل تھا۔ سلیمان نے اسلامی دنیا پر سب سے بڑا یہ احسان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز کو مشیر سلطنت بنایا اور مرتے دم تحریری وصیّت کی۔ کہ میرے بعد عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوں، سلیمان نے ۹۹ھ میں وفات پائی اور وصیّت کے موافق عمر بن عبدالعزیز مسندِ خلافت پر بیٹھے، ان کی خلافت نے دفعتہً حکومتِ مروانی کا رنگ بدل دیا۔ اور تمام ملک میں عدل و انصاف، علم و عمل، خیر و برکت کی روح تازہ ڈال دی، ایک مدت سے حضرت علیؓ پر خطبوں میں جو لعن پڑھا جاتا تھا، یک لخت موقوف کر دیا۔ شہزادگان بنو امیہ کے ہاتھوں سے جاگیریں چھین لیں۔ جہاں جہاں ظالم عمال تھے۔ یک قلم معزول کر دیئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ علومِ مذہبی کو وہ رونق دی کہ گھر گھر یہی چرچے پھیل گئے۔ امام زہری کو حکم دیا کہ حدیثوں کو یکجا کریں، یہ مجموعہ تیار ہوا۔ تو ممالکِ اسلامیہ میں اس کی نقلیں بھجوائیں۔

غرض حجاج اور ولید کے عہد تک تو امام ابو حنیفہ کو تحصیل علم کی طرف متوجہ ہونے کی نہ رغبت ہو سکتی تھی نہ کافی موقع مل سکتا تھا۔ تجارت باپ دادا کی میراث تھی۔ اس لئے خز بانی کا کارخانہ قائم کیا۔ اور حسنِ تدبیر سے اس کو بہت کچھ ترقی دی۔ لیکن سلیمان کے عہدِ خلافت میں جب درس و تدریس کے چرچے عام ہوئے تو ان کے دل میں بھی یہ تحریک پیدا ہوئی۔ حسنِ اتفاق یہ کہ ان ہی دنوں میں ایک اتفاقی واقعہ پیش آیا۔ جس سے ان کے ارادے کو اور بھی استحکام ہوا۔

تحصیل علم کی تحریک

ایک دن بازار جا رہے تھے۔ امام شعبی جو کوفہ کے مشہور امام تھے۔ ان کا مکان راہ میں تھا، سامنے سے نکلے تو اُنہوں نے ایک سمجھ کر کوئی نوجوان طالب علم ہے۔ پاس بلایا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو" اُنہوں نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبی نے کہا، "میرا مطلب یہ تھا، تم پڑھتے کس سے ہو؟" انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ کسی سے بھی نہیں، شعبی نے کہا کہ مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں۔ تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ اس نصیحت نے ان کے دل میں گھر کر لیا۔ اور نہایت اہتمام سے تحصیل علم پر متوجہ ہوئے۔ اس وقت تک علم جس چیز کا نام تھا، وہ ادب، انساب، ایام العرب، فقہ، حدیث، کلام تھا۔ کلام اگرچہ آج کل کا علم کلام نہ تھا، کیونکہ اس عہد تک مسائل اسلام پر فلسفہ کا پرتو نہیں پڑا تھا، تاہم ان علوم میں وقتِ نظر، بلندیِ خیال، زورِ طبع کے لیئے اس سے وسیع ترمیدان نہ تھا۔ اسلام جب تک عرب کی آبادی میں محدود رہا۔ اس کے مسائل نہایت محدود اور صاف رہے۔ لیکن فارس اور مصر و شام پہنچ کر ان میں رنگ آمیزیاں شروع ہو گئیں ان ملکوں میں اگرچہ حکمت و فلسفہ کا وہ زور باقی نہ رہا تھا۔ تاہم فلسفہ کے بگڑے بگڑائے مسائل عام لوگوں میں پھیل رہے تھے اور طبیعتیں عموماً باریک بینی اور احتمال آفرینی کی عادی تھیں۔

علم کلام

قرآن پاک میں خدا کی ذات وصفات، مبداء و معاد وغیرہ کے متعلق جو کچھ مذکور ہے عرب نے اس کو اجمالی نگاہ سے دیکھا اور خلوصِ اعتقاد کے لیے وہی کافی تھا بخلاف اس کے فارس اور شام میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہو گئیں جو وسعتِ تمدن اور ترقیِ خیالات کے لحاظ سے ضرور پیدا ہونی چاہئیں تھیں۔ استعارہ و تشبیہ، صفات کی عینیت وغیریت، حدوث و قدم، غرض اس قسم کے بہت سے مضامین نکل آئے۔ جن کو بحث و تدقیق کی وسعت نے مستقل فن بنا دیا۔ رفتہ رفتہ اعتقادی مسائل میں بھی

موشگافیاں ہونے لگیں اور راویوں کے اختلافات سے مختلف فرقے بنتے گئے، جو قدری مرجی، معتزلی، جہمی، خارجی، رافضی کہلائے، یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ اہلِ حق جواب تک ان بحثوں سے الگ تھے، ان کو بھی مخالفت کی ضرورت سے اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس طرح علم کلام پیدا ہو گیا۔ جس کو تدوین و ترتیب کی وسعت نے اس رتبہ کو پہنچایا کہ بڑے بڑے آئمہ مذہب (مثلاً امام اشعری و ابو منصور ماتریدی کا مایہ ناز ٹھہرا۔

علم کلام کی طرف توجہ

علم کلام زمانۂ مابعد میں اگرچہ مدوّن و مرتب ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس وقت تک اس کی تحصیل کے لیے صرف قدرتی ذہانت اور مذہبی معلومات درکار تھیں، قدرت نے امام ابو حنیفہ میں یہ تمام باتیں جمع کر دی تھیں۔ رگوں میں ایرانی خون اور طبیعت میں زور اور جدت تھی۔ مذہبی روائتیں اور مسائل کوفہ میں ایسے عام تھے کہ ایک معمولی شخص بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اُٹھ بیٹھ کر حاصل کر سکتا تھا۔ امام ابو حنیفہ نے اس فن میں وہ کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے اساتذۂ فن بحث کرنے میں ان سے جی چراتے تھے، تجارت کی غرض سے اکثر بصرہ جانا ہوتا تھا۔ جو ان تمام فرقوں کا دنگل اور خاص کر خارجیوں کا مرکز تھا۔ اباضیہ، صغریہ، حشویہ وغیرہ سے اکثر بحثیں کیں اور ہمیشہ غالب رہے۔ آخر ان جھگڑوں کو چھوڑ کر وہ علم فقہ پر مائل ہوئے اور تمام عمر اس کی نذر کر دی۔ لیکن اخیر تک یہ مذاق طبیعت سے نہ گیا۔ خارجیوں وغیرہ سے ان کے مناظرے علم کلام کی جان ہیں۔ ان کی علمی زندگی کے تذکرے میں ہم بعض واقعات کی تفصیل بیان کریں گے۔

فقہ سے دلچسپی کیوں پیدا ہوئی؟

شروع شروع میں تو امام صاحب اس فن کے بہت دلدادہ رہے۔ لیکن جس قدر عمر اور تجربہ بڑھتا جاتا تھا۔ ان کی طبیعت رُکتی جاتی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ۔

آغازِ عمر میں مَیں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا، کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد انہی باتوں پر ہے، لیکن پھر خیال آیا کہ صحابۂ کبار ان بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے، حالانکہ ان باتوں کی حقیقت ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا؟ ان کی توجہ جس قدر بھی فقہی مسائل پر تھی اور یہی مسائل وہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے، ساتھ ہی خیال گزرا کہ جو لوگ علمِ کلام میں مصروف ہیں۔ ان کا طرزِ عمل کیا ہے؟ اس خیال سے اور بھی بے دلی پیدا ہو گئی کیونکہ ان لوگوں میں وہ اخلاقی پاکیزگی اور روحانی اوصاف نہ تھے جو اگلے بزرگوں کا تمغۂ امتیاز تھا[1]۔ اسی زمانہ میں ایک دن ایک عورت نے آکر یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو سُنت کے طریق پر طلاق دینی چاہتا ہے کیونکر دے خود تو بتا نہ سکا۔ عورت کو ہدایت کی کہ امام حماد سے جن کا حلقۂ درس یہاں سے قریب ہے، جا کر پوچھے" یہ بھی کہہ دیا کر "حماد جو کچھ بتائیں مجھ سے کہتی جانا"۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی اور کہا، حماد نے یہ جواب دیا۔ مجھ کو سخت عبرت ہوئی۔ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ اور حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھا۔"

حماد کی شاگردی

امام کی ابتدائی تحصیل علم کے متعلق ایک اور روایت ہے جس کا سلسلہ سند خطیب نے امام تک پہنچایا، یعنی امام صاحب کا بیان ہے۔ کہ جب سے تحصیل علم پر توجہ کی تو بہت سے علوم پیش نظر تھے۔ اور میں متردد تھا کہ کس کو اختیار کروں۔ سب سے پہلے کلام کا خیال آیا۔ ساتھ ہی دل میں گزرا کہ وہ کوہ کندن و کاہ برآوردن ہے ایک مدت کی محنت و دردسری کے بعد کمال بھی پیدا کیا تو علانیہ اظہار نہیں کر سکتا کہ لوگ الحاد کی تہمت نہ لگائیں، ادب اور قرأت کا بجز اس کے کہ مکتب پڑھائیں۔ اور کچھ فائدہ نہ تھا شعر و شاعری میں ہجو اور جھوٹی مدح کے سوا اور کیا دھرا تھا، حدیث کے لیے اولاً تو ایک مدت درکار تھی۔ اور

---

[1] عقود الجمان باب سادس

ہر وقت یہ فکر رہتی کہ لوگ جرح و تعدیل کا نشانہ نہ بنائیں۔ آخر فقہ پر نظر پڑی اور دنیا و دین کی حاجتیں اس سے وابستہ نظر آئیں لیکن یہ روایت محض غلط ہے۔ تمام معتمد روائتیں اس کے خلاف ہیں۔ جو ریمارک امام صاحب کی طرف منسوب ہیں۔ ایسے جاہلانہ ریمارک ہیں کہ ایک معمولی آدمی کی طرف بھی نسبت نہیں کیے جا سکتے۔ اس روایت کو صحیح مانیں تو ماننا پڑے گا۔ کہ حدیث و کلام کی طرف امام ابوحنیفہ نے توجہ ہی نہیں کی۔ اس لیے کہ یہ ان کے شایان شان نہ تھے۔ حالانکہ ان فنون میں امام ابوحنیفہ کا جو پایہ ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تحصیلِ علوم کے بعد امام نے خیال کیا ہو کہ کس فن کو اپنا خاص فن بنائیں اور چونکہ عام خلائق کی ضرورتیں فقہ سے وابستہ دیکھیں۔ اسی کو ترجیح دی، یہی بات طرزِ بیان کی رنگ آمیزیوں سے اس حد تک پہنچ گئی، جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ روایت با ایں ہمہ کہ قیدِ کتابت میں آچکی تھی۔ عقود الجمان کے مصنف نے نقل کی تو بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے ابن جزلہ نے تاریخ بغداد کا جو اختصار کیا ہے ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں روایت کا جہاں ذکر ہے۔ ہر علم کے متعلق جو ریمارک ہیں۔ دوسروں کی طرف منسوب ہیں، امام ابوحنیفہ کی نسبت صرف ان کا تسلیم کرنا بیان کیا ہے۔

حماد کی شخصیت عظمت اور بزرگی

حماد کوفہ کے مشہور امام اور اُستادِ وقت تھے۔ حضرتِ انس رضؓ سے جو رسول اللہ کے خادم خاص تھے۔ حدیث سُنی تھی اور بڑے بڑے تابعین کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے اس وقت کوفہ میں انہی کا مدرسہ مرجع عام سمجھا جاتا تھا مسعر و شعبہ نے جو ائمہ فن خیال کیے گئے ہیں انہی کے حلقۂ درس میں تعلیم پائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی سے جو فقہ کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ اس کا مدار انہی پہ رہ گیا تھا۔ ان باتوں کے ساتھ زمانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ یعنی دولت مند اور فارغ البال تھے۔ اور اس

وجہ سے نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے، ان وجوہ سے امام ابو حنیفہؒ نے علم فقہ پڑھنا چاہا۔ تو استادی کے لیے انہی کو انتخاب کیا اس وقت درس کا طریقہ یہ تھا کہ استاد کسی خاص مسئلہ پر زبانی گفتگو کرتا تھا۔ جس کو شاگرد یاد کر لیتے اور کبھی لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے، کیونکہ مبتدیوں کے لیے یہ امتیاز عموماً قائم رکھا جاتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حماد کا تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں ان کا ہم سر نہیں ہے تو حکم دے دیا کہ ابو حنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں[1]۔

امام نے اگرچہ اسی زمانہ میں حدیث پڑھنی شروع کر دی تھی، جس کا تفصیلی بیان آگے آتا ہے۔ تاہم حماد کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں دو برس تک حماد کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتا رہا۔ پھر خیال ہوا کہ اب خود درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کروں۔ لیکن استاد کا ادب مانع ہوتا تھا اتفاق سے انہی دنوں حماد کا ایک رشتہ دار جو بصرہ میں رہا کرتا تھا مر گیا، حماد کے سوا اور کوئی اس کا وارث نہ تھا۔ اس ضرورت سے ان کو بصرہ جانا پڑا۔ چونکہ مجھ کو اپنا جانشین کر گئے تھے۔ تلامذہ اور ارباب حاجت نے میری طرف رجوع کیا۔ بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن میں استاد سے میں نے کوئی روایت نہیں سنی تھی۔ اس لیے اپنے اجتہاد سے جواب دیے اور احتیاط کے لیے ایک یادداشت لکھتا گیا۔ دو مہینے کے بعد حماد بصرہ سے واپس آئے۔ میں نے وہ یادداشت پیش کی۔ کل ساٹھ مسئلے تھے۔ ان میں سے بیس میں غلطیاں نکالیں باقی کی نسبت فرمایا کہ تمہارے جواب صحیح ہیں۔ میں نے عہد کیا کہ حماد جب تک زندہ ہیں ان کی شاگردی کا تعلق نہ چھوڑوں گا۔

حماد نے ۱۲۰ھ میں انتقال کیا، امام ابو حنیفہ نے اگرچہ حماد کے سوا اور

---

[1] عقود الجمان باب سادس۔

بزرگوں کی خدمت میں بھی فقہ کی تحصیل کی، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن خاص میں وہ حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے۔

امام صاحب اور تحصیل حدیث

حماد کے زمانہ میں ہی امام نے حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق جو امام کو مطلوب تھی۔ حدیث کی تکمیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اس وقت تمام ممالکِ اسلامیہ میں بڑے زور شور سے حدیث کا درس جاری تھا اور ہر جگہ سند اور روایت کے دفتر کھلے ہوئے تھے۔ صحابہ جن کی تعداد کم از کم دس ہزار تھی۔ تمام ممالک میں پہنچ گئے تھے، اور ان کی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ لوگ جہاں کسی صحابی کا نام سن پاتے تھے۔ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے کہ چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات سنیں یا مسائل شرعیہ کی تحقیق کریں۔ اس طرح تابعین کا جو صحابہ کے شاگرد کہلاتے تھے بے شمار گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے سلسلے تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔ جن شہروں میں صحابہ یا تابعین کا زیادہ مجمع تھا۔ وہ دار العلم کے لقب سے ممتاز تھے۔ ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، بصرہ، کوفہ کو خاص امتیاز تھا۔ کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہر ان مقامات کا ہم سر نہ تھا۔

کوفہ

کوفہ امام ابو حنیفہ کا مولد و مسکن تھا، اسلام کی وسعت و تمدن کا گویا دیباچہ تھا، اہلِ عرب کی روز افزوں ترقی کے لیے عرب کی مختصر آبادی کافی نہ تھی اس ضرورت سے حضرت عمرؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو جو اس وقت حکومت کسریٰ کا خاتمہ کر کے مدائن میں اقامت گزین تھے۔ خط لکھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک شہر بسائیں جو اُن کا دار الہجرت اور قرار گاہ ہو۔ سعدؓ نے کوفہ کی زمین پسند کی ۱۷ھ میں اس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا۔ اور معمولی سادہ وضع کی عمارتیں تیار ہوئیں۔ اسی وقت عرب

کے قبائل ہر طرف سے آ آ کر آباد ہونے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ تھوڑے دنوں میں وہ عرب کا ایک خطہ بن گیا۔ حضرت عمرؓ نے یمن کے بارہ ہزار اور نزار کے آٹھ ہزار آدمیوں کے لیے جو وہاں جاکر آباد ہوئے تھے روزینے مقرر کر دیئے، چند روز میں جمعیت کے اعتبار سے کوفہ نے وہ حالت پیدا کی کہ وہ جناب فاروق کوفہ کو "رمح اللہ، کنز الایمان جمجمۃ العرب" یعنی خدا کا نیزہ، ایمان کا خزانہ عرب کا سر فرمایا کرتے تھے اور خط لکھتے تو اس عنوان سے لکھتے تھے الی راس الاسلام الی راس العرب" حضرت علیؓ نے اس شہر کو دار الخلافہ قرار دیا۔ صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص جن میں چوبیس وہ بزرگ تھے جو غزوہ بدر میں رسول اللہؐ کے ہمرکاب رہے تھے۔ وہاں گئے اور بہتوں نے سکونت اختیار کر لی ان بزرگوں کی بدولت ہر جگہ حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے تھے اور کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث و روایت کا درسگاہ بن گیا تھا۔[1]

بصرہ

بصرہ بھی اسی مقدس خلیفہ کے حکم سے آباد ہوا تھا۔ اور وسعت علم اور اشاعتِ حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا یہ دونوں شہر مکۃ معظمہ اور مدینہ منورہ کی طرح علم اسلامی کے دار العلم خیال کیے جاتے تھے علامہ ذہبی نے اسلام کے دوسرے تیسرے دَور میں جن لوگوں کو حاملین حدیث کا لقب دیا ہے، اور ان کے مستقل ترجمے لکھے ہیں، ان میں اکثر مثلاً مسروق بن الاجدع، عبیدہ بن عمر، اسود بن یزید، ابو العمر النخعی، ذر بن جبیش ربیع بن خثیم، عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابو عبد الرحمٰن السلمی، شریح بن الحرث، شریح بن ہانی، ابو وائل شقیق ابن سلمہ، قیس بن حازم، محمد بن سیرین حسن بصری، شعبہ بن حجاج، قتادہ بن وعامہ انہی دونوں شہروں کے رہنے والے یا خوش باش تھے۔[2] سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، اکثر فرماتے تھے

---

[1] یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری ذکر آثارِ کوفہ و معجم البلدان و فتح المغیث صفحہ ۳۸۲ میں مذکور ہے [2] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی میں یہ تصریح موجود ہے۔

کہ مناسک کے لیے مکہ قرأت کے لیے مدینہ اور حلال وحرام یعنی تفقہ کے لیے کوفہ ہے[1]۔ فقہ میں امام نے زیادہ تر حماد کا حلقہ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی۔ یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی۔

علم حدیث اور مسئلہ روایت و درایت

حدیثیں اس وقت نہایت پریشان اور غیر مرتب تھیں، یہاں تک کہ بڑے بڑے اساتذہ دو چار سو حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے، یہ تعداد ضروری مسائل کے لیے بھی کافی نہ تھی۔ اس کے علاوہ طریق روایت میں اس قدر اختلافات پیدا ہو گئے کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریقوں سے نہ معلوم ہو۔ اس کے مفہوم و تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ہونا دشوار تھا۔ امام ابوحنیفہ کو حماد کی صحبت اور پختگی عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح واقف کر دیا تھا۔ اس لیے نہایت سعی و اہتمام سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا، جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی تہ نہ کیا ہو۔ اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں ابوالمحاسن شافعی نے جہاں ان کے شیوخِ حدیث کے نام گنائے ہیں، ترانوے شخصوں کی نسبت لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے یا نزیل تھے۔ تہذیب التہذیب و تہذیب الاسماء و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں اگرچہ (جیسا کہ ان کتابوں کا طریقہ عام ہے) امام کے شیوخ کا استقصاء نہیں کیا ہے، تاہم انہی کتابوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی، جن میں ۲۹ شخص خاص کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان میں اکثر تابعی تھے، شیوخ کوفہ میں خاص کر امام شعبی، سلمہ بن کہیل، محارب بن وثار، ابواسحاق سبلعی، عون بن عبداللہ، سماک بن حرب، عمرہ بن مرہ، منصور العمر، اعمش، ابراہیم بن محمد، عدی بن ثابت

---

[1] معجم البلدان ذکر کوفہ۔

الانصاری، عطاء بن السائب، موسیٰ بن ابی عائشہ، علقمہ بن مرثد بہت بڑے محدث اور سند و روایت کے مرجع عام تھے سفیان ثوری اور امام حنبل وغیرہ کا سلسلۂ سند اکثر انہی بزرگوں تک پہنچتا ہے۔

حضرت امام شعبی

امام شعبی[۱] وہی بزرگ ہیں۔ جنہوں نے اول اول امام ابوحنیفہ کو تحصیل علم کی رغبت دلائی تھی۔ بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کی تھیں مشہور رہے کہ پانسو صحابہ کو دیکھا تھا، عراق، عرب، شام میں چار شخص جو استاد کامل تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان میں ایک یہ تھے۔ امام زہری کہا کرتے تھے کہ "عالم صرف چار ہیں، مدینہ میں ابن المسیّب بصرہ میں حسن، شام میں مکحول کوفہ میں شعبی" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو ایک بار مغازی کا درس دیتے دیکھا تو فرمایا کہ واللہ یہ شخص اس فن کو مجھ سے اچھا جانتا ہے"۔ ایک مدت تک منصب قضا پر مامور رہے، خلفاء اور اعیانِ دولت ان کا نہایت احترام کرتے تھے سنہ ۱۰۴ھ میں یا سنہ ۱۰۶ھ میں وفات پائی۔

سلمہ بن کہیل، مشہور محدث اور تابعی تھے، جندبؓ بن عبداللہ ابن ابی اوفیؓ ابو الطفیلؓ اور ان کے علاوہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ سفیان بن عیینہ (امام شافعی کے استاد) فرماتے تھے کہ سلمہ بن کہیل ایک رکن ہیں ارکان میں سے، ابن مہدی کا قول تھا کہ کوفہ میں چار شخص سب سے زیادہ صحیح الروایہ تھے، منصور، سلمہ، عمرو بن مرہ، ابو حصین۔

حضرت ابو اسحٰق سبعی

ابو اسحٰق سبعی اکابر تابعین میں سے تھے، عبداللہؓ بن عباس، عبداللہ بن عمرؓ ابن زبیرؓ، نعمانؓ بن بشیرؓ، زید بن ارقمؓ اور بہت سے صحابہ سے جن کے نام علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں بہ تفصیل

---

[۱] امام کے شیوخ حدیث کا حال میں نے زیادہ تر تہذیب التہذیب و معارف ابن قتیبہ و مراۃ الجنان یافعی سے لکھا ہے۔

لکھے ہیں حدیثیں سنی تھیں۔ عجلی نے کہا ہے کہ ۳۸ صحابہ سے ان کو بالمشافہ روایت ہے علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد تھے۔ ان کا قول ہے، کہ ابو اسحٰق کے شیوخ حدیث میں نے شمار کیے تو کم و بیش تین سو ٹھہرے، حافظ ابن حجر نے تہذیب میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

حضرت سماک

سماک بن حرب، بہت بڑے تابعی اور محدث تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا ہے کہ سماک نے کبھی حدیث میں غلطی نہیں کی۔ خود سماک کا بیان ہے کہ میں اسی صحابہ سے ملا ہوں۔

حضرت محارب بن وثار

محارب بن وثار نے عبداللہ بن عمر اور جابر رضؓ وغیرہ سے روایت کی۔ امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی زاہد کو نہیں دیکھا جس کو محارب پر ترجیح دوں۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ محارب عموماً حجۃ ہیں۔ امام احمد ابن معینؒ ابو زرعہ، دارقطنی، ابوحاتم، یعقوب، ابن سفیان، نسائی نے ان کو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ کوفہ میں منصب قضا پر مامور تھے سنہ ۱۱۶ھ میں وفات کی۔ عون بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ نہایت ثقہ اور پرہیز گار تھے۔

امام حدیث ہشام بن عروہ

ہشام بن عروہ، معزز و مشہور تابعی تھے بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں بڑے ائمہ حدیث مثلاً سفیان ثوری، امام مالک سفیان ابن عیینہ ان کے شاگرد تھے، ابوجعفر منصور کے زمانہ میں ان سے حدیثیں روایت کیں۔ خلیفہ منصور ان کا نہایت احترام کرتا تھا۔ ایک بار لاکھ درہم اُن کو عطا کیے ان کے جنازہ کی نماز بھی منصور ہی نے پڑھائی تھی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ابوحاتم نے ان کو امام حدیث کہا ہے۔

نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَمَنۡ یُؤۡمِنۡ بِاللّٰہِ وَیَعۡمَلۡ صَالِحًا" اس قسم کی اور آیتیں ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان نہیں جاتا رہتا، البتہ اگر تصدیق و اعتقاد نہ ہو تو مومن کا اطلاق نہیں ہو سکتا، عمل و تصدیق کا دو جُداگانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں، لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ دین و مذہب سب کا ایک ہی ہے، خدا نے خود کہا ہے۔ شَرَعَ لَکُمۡ عَنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَمَا وَصّٰی بِہٖ اِبۡرٰھِیۡمَ وَمُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ یعنی تمہارے لیے اسی دین کو مشروع کیا، جس کی وصیت نوح کو کی تھی۔ اور جو تجھ پر وحی بھیجی، اور جس کی وصیت ابراہیم و موسیٰ و عیسےٰ کو ملی وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔"

آپ کو جاننا چاہئے کہ تصدیق میں ہدایت اور اعمال میں ہدایت یہ دونوں دو چیزیں ہیں، آپ ایک شخص کو جو فرائض سے ناواقف ہو مومن کہہ سکتے ہیں، پس ایسا شخص فرائض کے لحاظ سے جاہل اور تصدیق کے لحاظ سے مومن ہے۔ خود خدا نے قرآن پاک میں یہ اطلاقات کیے ہیں۔ کیا آپ اس شخص کو جو خدا اور رسول خداؐ کے پہچاننے میں گمراہ ہو اس شخص کے برابر قرار دیں گے۔ جو مومن ہو، لیکن اعمال سے ناواقف ہو، خدا نے جہاں فرائض بتائے ہیں۔ اس موقع پر ارشاد فرمایا ہے۔ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اِنۡ تَضِلُّوۡا (یعنی خدا نے اس لیے بیان کیا کہ تم گمراہ نہ ہو) دوسری آیت میں ہے۔ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰھُمَا الۡاُخۡرٰی (یعنی ایک بھول جائے تو دوسرا یاد دلائے) حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا۔ فَعَلۡتُہَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیۡنَ یعنی میں نے جب وہ کام کیا تب میں گمراہ تھا۔ ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں، جو اس دعوے کے ثبوت کے لئے دلائل قاطعہ ہیں، اور حدیثیں تو اور بھی واضح اور صاف ہیں، حضرت عمرؓ اور

حضرت علیؓ امیر المومنین کے لقب سے پکارے جاتے تھے، تو کیا اُس کے یہ معنے تھے کہ وہ صرف ان لوگوں کے امیر تھے جو فرائض اور اعمال کے پابند تھے، حضرت علیؓ نے شام والوں کو جو ان سے لڑتے تھے) مومن کہا، کیا قتل سے بڑھ کر کوئی گناہ ہے۔ پھر جو لوگ قتل کے مرتکب ہوئے، کیا آپ قاتلین اور مقتولین دونوں کو برسرِ حق قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ صرف ایک (یعنی حضرت علیؓ اور طرفدارانِ علیؓ کو برسرِ حق تسلیم کریں گے، تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے؟ اس کو خوب سمجھ لیجئے اور غور کیجئے۔ میرا یہ قول ہے، کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں، اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہو سکتے، جو شخص ایمان کے تمام فرائض بجا لاتا ہے۔ وہ مومن اور جنتی ہے۔ جو ایمان اور اعمال دونوں کا تارک ہے، وہ کافر اور دوزخی ہے، جو شخص ایمان رکھتا ہے، اور فرائض اس سے ترک ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمان ضرور ہے۔ لیکن گنہگار مسلمان ہے، خدا کو اختیار ہے۔ اس پہ عذاب کرے یا معاف کر دے۔

امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، فرائض اور ایمان کے باہمی امتیاز کی اس سے عمدہ تر کیا دلیل ہو گی کہ آغاز اسلام میں ایمان کی دعوت ہوتی تھی۔ اور فرائض کا وجود نہ تھا، امام صاحب نے قرآن کی جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں۔ ان سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں، کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو ایمان پہ معطوف کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جزو کل پہ معطوف نہیں ہو سکتا۔ مَنْ يُؤْمِن باللهِ فَيَعمَلْ صَالحاً میں حرفِ تعقیب آیا ہے، جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے۔

ان دلائل قاطعہ کے مقابلہ میں دوسری طرف بعض آیتیں اور حدیثیں ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی اثباتِ مدعا کے لیے کافی نہیں، بڑا استدلال اس حدیث پہ ہے، کہ "مومن مومن ہو کر زنا اور چوری نہیں کرتا"۔ حالانکہ یہ کلام کے زور دینے کا ایک پیرایہ

ہے۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ بھلا آدمی ہو کر تو ایسا کام نہیں کر سکتا، جس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ وہ کام شان شرافت کے خلاف ہے، بے شبہ زنا اور سرقہ بھی ایمان کی شان کے خلاف ہیں اور حدیث کا مقصد اسی قدر ہے۔ ورنہ ابوذرؓ کی حدیث میں صراحتہً یہ الفاظ موجود ہیں کہ جو شخص لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا قائل ہے، جنت میں جائے گا، گو زانی اور چور ہو۔

ایمان کم اور زیادہ نہیں

دوسرا مسئلہ یہ ہے۔ کہ "الایمان لا یزید ولا ینقص" یعنی ایمان کم و بیش نہیں ہو سکتا، بے شبہ یہ امام صاحب کا قول ہے، لیکن اس کی تعبیر میں لوگوں نے غلطی کی ہے، نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی، ایمان کی کمی و زیادتی دو لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولۂ کیف سے ہے، جس میں شدت اور ضعف ممکن ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان یقین کا نام ہے اور یقین کے مراتب متضادت ہوتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے کہا کہ "اے خدا تو مُردوں کو کیونکر جلاتا ہے"، تو ارشاد ہوا وَلَمْ تُؤمِنْ یعنی کیا اب تک تجھ کو یقین نہیں آیا"۔ عرض کیا کہ "یقین ضرور ہے لیکن لِیَطْمَئِنَّ قلبی اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں، خدا نے متعدد آیتوں میں تصریح کر دی ہے، کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے۔ زادَتھُمْ ایمَانًا" اس مسئلہ میں نص صریح ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کو بلحاظ اس معنی کے نہ انکار ہے، نہ یہ امر اس وقت زیر بحث تھا امام صاحب کے دعویٰ کا اور منشا ہے اور وہ بالکل صحیح ہے، جن لوگوں نے عمل کو جزو ایمان قرار دیا، ان کا مذہب ہے۔ کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ کم ہوتا ہے، جو شخص اعمال کا پابند ہے۔ وہ زیادہ مومن ہے۔ جو گناہگار ہے، وہ کم مومن ہے۔ محدثین صراحتہً اس کے مدعی ہیں اور اس پر دلیلیں لاتے ہیں علامہ قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں فاعلمان الایمان یزید بالطاعات وینقص بالمعصیۃ یعنی "ایمان

ثواب کے کام کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور گناہ کرنے سے گھٹ جاتا ہے"۔ اور محدثین نے بھی جا بجا اس کی تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ اس اعتبار سے ایمان کی زیادت و نقصان کے منکر تھے، ان کے نزدیک جب اعمال جزوِ ایمان نہیں تو اعمال کی کمی بیشی سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، اور یہ بالکل صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ "ابو بکر کو تم لوگوں پر جو ترجیح ہے وہ کثرتِ صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے۔ جو اس کے دل میں ہے، غرضیکہ امام صاحب کا یہ دعوےٰ نہیں ہے۔ کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت وضعف کے زیادہ وکم نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم وبیش نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ اس بات کی فرع ہے۔ کہ اعمال جزوِ ایمان نہیں ہیں اور اس کو ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔

ایمان میں سب برابر ہیں

امام صاحب اس بات کے بھی قائل تھے کہ مطلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں، ایمان کے لیے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ وہ سب کے لیے یکساں ہیں۔ صحابہ اور عام مسلمان اس لحاظ سے برابر ہیں۔ کہ دونوں ایک ہی چیز یعنی توحید و نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرق ہے تو اعتقاد کی شدت اور ضعف میں ہے اسی مطلب کو امام صاحب نے عثمان بتی کے جواب میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے۔ کہ دین اهل السمآء والارض واحد یعنی آسمان وزمین والوں کا ایک ہی دین ہے، پھر اس دعویٰ پر آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا" یعنی ہم نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا، جس کی وصیت نوح کو کی تھی۔ مخالفین نے بڑے زور شور سے امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے۔ کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ میرا ایمان اور ابو بکر صدیقؓ کا ایمان برابر ہے۔ اگرچہ امام صاحب کی طرف اس قول کی اسناد ثابت نہیں لیکن اگر ثابت ہو تو کیا نقصان ہے۔ جس اعتبار سے وہ مساوات کے مدعی ہیں

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ایسا صاف مسئلہ معترضوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ خطیب بغدادی نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیے اور یہ نہ سمجھے کہ امام صاحب کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کو یہ الفاظ نہایت گراں گزرتے ہیں کہ ہمارا اور صحابہ کا ایمان برابر ہے" وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بہت سی چیزوں میں ہم اور صحابہ برابر ہیں، تاہم ہم میں اور صحابہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اگرچہ اس قسم کے تمام مسائل میں امام صاحب اپنی خاص رائیں رکھتے تھے، لیکن وہ مخالف راویوں پر کفر و فسق کا الزام نہیں لگاتے تھے، یہ فیاض دلی امام صاحب کا خاصہ ہے۔ اور قرنِ اول کے بعد اسلام میں اس کی بہت کم نظیریں ملتی ہیں، اسلام کو کسی چیز نے ان مشاجرات سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جو اختلافِ آراء کی بنا پر قائم ہو گئے ان اختلافات کی بنیاد اگرچہ خود صحابہ کے زمانہ سے شروع ہو چکی تھی۔ عبداللہ بن عباسؓ اور بہت سے صحابہ کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہ (صلعم) نے معراج میں خدا کو آنکھوں سے دیکھا، حضرت عائشہؓ نہایت اصرار سے اس کے مخالف تھیں، امیر معاویہؓ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عائشہ سماعِ موتی کی قائل نہ تھیں لیکن اس زمانہ تک ان اختلافات پر ہدایت و گمراہی کا مدار نہ تھا۔ جو لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے۔ ان میں بھی کسی نے کسی کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جو غلط تاویل کرتے ہیں اور ہم کو کافر قرار دیتے ہیں۔ وہ خود کافر ہیں یا نہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ اس وقت تک کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا، جب تک خدا کو دو نہ کہے[1]" صحابہ کے بعد یہ اختلافات زور پکڑتے گئے اور رفتہ رفتہ مستقل فرقے قائم ہو گئے، اعتقادی اور فقہی مسائل اکثر ایسے ہیں۔ جن میں نص قاطع موجود نہیں اور ہیں تو متعارض ہیں۔ اس لیے استنباط اور رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی اور سینکڑوں رائیں

---

[1] آثار امام محمد صفحہ ۶۵

قائم ہو گئیں، بے شبہ ان میں بہت سی رائیں صحیح نہیں، لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ سب کفر ہوں

افسوس ہے کہ سرگرم طبیعتیں جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشہ میں سرشار تھیں۔ اختلاف رائے کے صدمہ کی تاب نہ لا سکیں اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہو گئیں، بات بات پر کفر کے فتوے ہونے لگے، جو لوگ جس قدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے اسی قدر کفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہر فریق نے دوسرے کی ضلالت و گمراہی ثابت کرنے کے لیے موضوع روایتوں سے اعانت لی اور اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں، کہ میری اُمت میں ۷۲، فرقے پیدا ہوں گے جن میں صرف ایک جنتی ہو گا، باقی سب دوزخی۔ اس فرضی تعداد کو بھی پورا کرنا ضرور تھا۔ اس لیے کھینچ تان کر ۷۳، فرقے قرار دیئے اور سب کے الگ الگ نام رکھے، اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ہر ہر فرقے کے لیے جُدا جدا روائتیں گھڑیں مثلاً: القدریة مجوس هذه الامه وغیرہ وغیرہ۔

تکفیر نہیں کرتے تھے

ان تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزء پراگندہ کر دیے اور مذہب، اخلاق، حکومت، تمدن معاشرت کا سب نقشہ بگڑ گیا، اس عالمگیر آشوب میں صرف ایک امام ابو حنیفہ تھے، جن کی صدا سب سے الگ تھی۔ اور جو پکار کر کہتے۔ لا نکفر احدًا من اهل القبلة یعنی ہم اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں سمجھتے۔" اس وقت تو اس صدا پر چنداں توجہ نہیں ہوئی لیکن زمانہ جس قدر ترقی کرتا گیا۔ اس جملہ کی قدر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ علم کلام کا ایک بیش بہا اصول بن گیا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اس پر عمل کم کیا گیا اور تکفیر کے غلغلے اب بھی پست نہ ہوئے۔

اہل قبلہ سب مومن ہیں

امام صاحب کی یہ رائے بہت غور و تحقیق و تجربہ کے بعد قائم ہوئی، بڑے بڑے مشہور بانیانِ مذہب انہی کے

زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور امام صاحب کو ان سے ملنے کا موقع حاصل ہوا تھا، خارجیوں کا صدر مقام بصرہ تھا جو امام صاحب کے شہر سے نہایت قریب تھا۔ واصل بن عطاء و عمرو بن عبید جو مذہب اعتزال کے بانی اور مروّج تھے، بصرہ ہی کے رہنے والے اور امام صاحب کے ہمعصر تھے، جہم بن صفوان جس کے نام پر فرقۂ جہمیہ مشہور ہے۔ اسی زمانہ میں تھا۔ امام صاحب ان میں سے اکثروں سے ملے اور ان کے خیالات سے مطلع ہوئے ان فرقوں کی نسبت جو اقوال مشہور تھے کچھ تو سرے سے غلط اور افترا تھے، بعض کی تعبیر غلط طور پر کی گئی تھی، بعض در اصل لغو و باطل تھے، لیکن کفر کی حد تک نہ پہنچے تھے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ نے یہ عام حکم دیا کہ "اہل قبلہ سب مومن ہیں"۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مسائل پر قیامتیں برپا ہیں۔ جو کفر و اسلام کی معیار قرار دی گئی ہیں، وہ صرف لفظی بحثیں اور فرضی اصطلاحیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ قِدم قرآن کا تھا۔ جس کو لوگوں نے کلمۂ توحید کے برابر قرار دیا تھا۔ بڑے بڑے علماء کا قول ہے۔ کہ اسلام کو دو شخصوں نے نہایت نازک وقتوں میں محفوظ رکھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے رسول اللہ (صلعم) کی وفات کے بعد مرتدین عرب کا استیصال کیا، اور امام احمد بن حنبل جو مامون رشید کے زمانہ میں حدوث قرآن کے منکر رہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے امام احمد بن حنبل کو ترجیح ہے۔ کیونکہ صحابہ حضرت ابوبکرؓ کے معاون اور انصار تھے لیکن امام احمد کا کوئی مددگار نہ تھا۔"

حدیث اور اصولِ حدیث کے بارے میں امام صاحب کا مسلک

یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ علم حدیث میں کم مایہ تھے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام طور پر وہ محدّث کے لقب سے مشہور نہیں، بزرگانِ سلف میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں۔ جو اجتہاد و روایت دونوں کے جامع تھے، لیکن شہرت اسی صفت کے ساتھ ہوئی، جو ان کا کمال غالب تھا۔ امام ابوحنیفہ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں ہے، تعجب ہے۔ کہ امام مالک و امام شافعی بھی اس لقب کے ساتھ مشہور نہ ہوئے، نہ اُن کی تصنیفوں کو وہ قبولِ عام حاصل ہوا جو صحاح ستہ کو ہوا، امام احمد بن حنبل ان لوگوں کی نسبت علم حدیث میں زیادہ نام آور ہیں، ان کی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ اور کوئی نہیں مِل سکتا لیکن جس قدر حدیث و روایت میں ان کا زیادہ اعتبار ہے۔ اسی قدر استنباط اور اجتہاد میں ان کی نام آوری کم ہے۔ علامہ طبری نے جو خود بھی محدث اور مجتہد تھے، مجتہدین میں ان کا شمار نہیں کیا[1] قاضی ابن عبدالبر نے کتاب الانتہاء فی الثلثۃ الفقہاء میں جو مجتہدین کے حالات میں ہے، امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی پر اکتفا کی، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں۔ کہ امام شافعی کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا۔" اگرچہ امام احمد بن حنبل کی نسبت گروہِ کثیر علماء کی یہی رائے تھی، کہ وہ اجتہاد کامل کا منصب رکھتے تھے۔

مجتہد و محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں

حقیقت یہ ہے کہ مجتہد و محدث مواعظ و قصص، فضائل و سیر ہر

---

[1] طبقات المفسرین حافظ جلال الدین سیوطی علامہ طبری۔

ایک قسم کی روائتوں کا استقصاد کرتا ہے، بخلاف اس کے مجتہد کو زیادہ تر صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے۔ جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ محدثین کی بہ نسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروایہ ہوئے۔ موطا میں جو امام مالک کی تمام روایتوں کا مجموعہ ہے زیادہ سے زیادہ ہزار حدیثیں ہیں۔ جن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ امام شافعی نے امام احمد بن حنبل کے سامنے اکثر اعتراف کیا ہے۔ کہ تم لوگ بہ نسبت ہمارے احادیث سے زیادہ واقف ہو۔ قاضی یحییٰ بن اکثم جو ترمذی کے شیخ ہیں۔ حسرت سے کہا کرتے تھے، کہ اگر شافعی نے علم حدیث کی طرف پوری توجہ کی ہوتی تو ہم لوگوں کو سب سے بے نیاز کر دیا ہوتا۔[1]

خلفائے اربعہ کی قلت روایت

اس قدر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغازی قصص سیر وغیرہ میں ان کی نظر چنداں وسیع نہ تھی۔ امام مالک و امام شافعی کا بھی یہی حال تھا، لیکن احکام و عقائد کے متعلق امام ابوحنیفہ کو جو واقفیت اور تحقیق حاصل تھی، اس سے انکار کرنا صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے، ان کی تصنیفات یا روائتوں کا مدوّن نہ ہونا قلت نظر کی دلیل نہیں ہو سکتا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ کسی صحابی کو رسول اللہ (صلعم) کے ساتھ جلوت و خلوت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ (صلعم) کے اقوال و افعال سے جس قدر وہ واقف تھے اور کون ہو سکتا تھا، لیکن حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی روایت سے جس قدر صحیح حدیثیں ہیں ان کی تعداد ستّر سے زیادہ نہیں۔ کون شخص کہہ سکتا ہے، کہ ان کو صرف اسی قدر حدیثیں معلوم تھیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد عمر فاروقؓ کا درجہ ہے، ان سے بھی پچاس حدیثیں[1]

---

[1] مناقب الشافعی الامام الرازی، خلفائے اربعہ کی نسبت یہ تعداد میں نے امام شافعی کے قول کے مطابق لکھی ہے اور محدثین کے نزدیک اس سے زیادہ حدیثیں ان لوگوں سے مروی ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ تعداد نہیں پہنچتی، جس پر کثرت روایت کا اطلاق کیا جائے۔

مروی ہیں۔ جن میں سے بعض کا کافی ثبوت نہیں، حضرت عثمانؓ اور جناب امیرؓ کا بھی یہی حال ہے، بخلاف ان کے حضرت ابوہریرہؓ سے ۵۳۴۶، انس سے ۲۲۸۶ عبداللہ بن عباس سے ۲۲۶۰ جابرؓ سے ۲۵۴۰، عبداللہ ابن عمرؓ سے جو رسول اللہ، (صلعم) کے زمانہ میں نوجوان تھے، ۲۶۳ حدیثیں مروی ہیں۔ اگر روایتوں کا موجود ہونا ہی معیار ہے، تو خلفائے اربعہ کی نسبت تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ان کا حافظہ ضعیف اور نہایت ضعیف تھا یا والستہ ان کو رسول اللہ (صلعم) کے اقوال و افعال کی طرف التفات اور توجہ نہ تھی، وحاشا ھم عن ذالک

بخاری و مسلم نے امام شافعی کے واسطے سے کوئی حدیث روایت نہیں کی

یہ سچ ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین نے امام صاحب سے روایت نہیں کہ (دو ایک روائتیں مستثنیٰ ہیں) لیکن اس الزام میں اور ائمہ بھی ان کے شریک ہیں، امام شافعی نے جن کو بڑے بڑے محدثین مثلاً امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور حمیدی، ابوذرعہ الرازی ابوحاتم نے حدیث اور روایت کا مخزن تسلیم کیا ہے، ان کی سند سے صحیحین میں ایک روایت بھی موجود نہیں، بلکہ بخاری و مسلم نے کسی اور تصنیف میں بھی امام شافعی کی سند سے کوئی روایت نہیں کی، امام رازی نے بخاری و مسلم کی اس بے اعتنائی کی بہت سی تاویلیں کی ہیں۔ مگر کوئی معقول بات نہیں بتا سکے یہ صحیحین پر موقوف نہیں، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں بھی بہت کم ایسی حدیثیں ہیں۔ جن کے سلسلہ رواۃ میں امام شافعی کا نام آیا ہو۔

امام بخاری نے روایت کیوں نہیں قبول کی؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض محدثین نے اعتماد اور استنباط کا جو معیار قرار دیا تھا۔ اس میں اہل نظر بلکہ اکثر لوگوں کے لیے کم گنجائش تھی، علامہ قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے، کہ میں نے کسی

ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا الا یمان ۔ قول وعمل اگر یہ صحیح ہے تو امام ابو حنیفہ کو ان کے دربار میں پہنچنے کی کیونکر اُمید ہو سکتی تھی

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام شافعی کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن جس بے پروائی سے کیا ہے ۔ اس کے لحاظ سے امام رازی نے یہی غنیمت سمجھا کہ تضعیف نہیں کی چنانچہ امام شافعی کے فضائل میں فرماتے ہیں :- واما الامام محمد بن اسمٰعیل البخاری فقد ذکرالشافی فی تاریخہ الکبیر فقال فی باب محمد بن عبد اللہ محمد الشافعی القرشی مات سنۃ اربع وماتین ثمانہ ماذکرہ فی باب الضعفآء مع علمہ بانہ قد روی شیئاً کثیراً من الحدیث ولو کان من الضعفآء فی ھذا الباب الذکرہ" یعنی " امام بخاری نے شافعی کا ذکر تاریخ کبیر میں کیا ہے ، چنانچہ فلاں باب میں لکھا ہے کہ محمد بن ادریس بن عبد اللہ محمد الشافعی القرشی نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی لیکن ان کو ضعفا کے باب میں ذکر نہیں کیا ۔ حالانکہ امام بخاری جانتے تھے اکر شافعی نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں اور اگر وہ اس باب میں ضعیف ہوتے تو امام بخاری ضرور ان کو ضعیف لکھتے " ۔

امام اوزاعی جو محدث اور مجتہد مستقل تھے ۔ اور بلادِ شام میں ان کا وہی اعزاز و اعتبار تھا جو عرب و عراق میں امام مالک و شافعی کا اُن کی نسبت کسی نے امام احمد حنبل سے رائے پوچھی فرمایا ۔ حدیث ضعیف ورای ضعیف[1]

لطف یہ ہے کہ مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں ، وہ دقتِ نظر قوتِ استنباط استخراجِ مسائل ، تفریع احکام ہے ، لیکن محدثین کے ایک گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب و نقص میں داخل ہیں ، علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری ، قاضی ابو یوسف کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اہل حدیث میں سے ایک گروہ نے ان کی روایت سے اس بنا پر احتراز کیا ، کہ ان پر رائے غالب تھی اور فروع احکام کی تفریع کرتے تھے ۔ ان باتوں کے ساتھ بادشاہ کی صحبت

میں رہتے تھے، اور منصب قضا پہ مامور تھے[1] اگر فروع اور احکام کا استنباط بھی جرم ہے، تو بے شبہ امام ابو حنیفہ قاضی ابو یوسف سے زیادہ مجرم ہیں۔

البتہ یہ بات غور کے قابل ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اتباع کو کیوں اہل الرائے کہا جاتا تھا، اس بات میں اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شہرت عام کے مقابلے میں تحقیق کی پروانہ کی۔

اہل الرائے کی تحقیق

اس بحث کے تصفیہ کے لیے سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ یہ لقب کب ایجاد ہوا، اور کن لوگوں پر اطلاق کیا گیا جہاں تک ہم کو علم ہے اس لقب کے ساتھ اول جس کو یہ امتیاز حاصل ہے وہ ربیعۃ الرائے ہیں، جو امام مالک کے استاد اور شیخ الحدیث تھے، رائے کا لفظ ان کے نام کا جزو بن گیا ہے اور تاریخ اور اسماء الرجال میں ہمیشہ ان کا نام ربیعۃ الرائے لکھا جاتا ہے، یہ مشہور محدث اور فقیہ تھے، اور بہت سے صحابہ سے ملے تھے، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اُن سے احتجاج کیا ہے" عبدالعزیز ماجشون کا قول ہے کہ" واللہ میں نے ربیع سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں، دیکھا"

جو لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے

اسی زمانہ میں اور اس کے بعد کے اور لوگ بھی اس لقب سے پکارے گئے، محدث ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں اہل الرائے کی سرخی سے ایک باب باندھا ہے اور عنوان کے نیچے یہ نام لکھے ہیں" ابن ابی لیلے، ابو حنیفہ، ربیعۃ الرائے زفر، اوزاعی، سفیان ثوری، مالک بن انس، ابو یوسف قاضی، محمد بن حسن" ابن قتیبہ نے سنہ ۲۶۷ھ میں وفات پائی، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ کم از کم تیسری صدی تک مذکورہ بالا لوگ اہل لرائے کے لقب سے مشہور تھے، اگرچہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا)

---

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ قاضی ابو یوسف

محدث ہیں، لیکن امام مالک، سفیان ثوری، امام اوزاعی کی شہرت تو محتاج بیان نہیں ۔

محدثین میں دو گروہ تھے

اصل یہ ہے کہ جو لوگ علم حدیث کے درس تدریس میں مشغول تھے، ان میں دو فرقے قائم ہو گئے تھے ایک وہ جن کا کام صرف حدیثوں اور روایتوں کا جمع کرنا تھا ۔ وہ حدیث سے صرف من حیث الروایۃ بحث کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو ناسخ و منسوخ سے بھی سروکار نہ تھا، دوسرا فرقہ حدیثوں کو استنباطِ احکام اور استخراج مسائل کے لحاظ سے دیکھتا ہے اور کوئی نص صریح نہیں ملتی تھی ۔ تو قیاس سے کام لیتا تھا ۔ اگرچہ یہ دونوں حیثیتیں دونوں فریق میں کسی قدر مشترک تھیں ۔ لیکن وصف غالب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز تھا، پہلا فرقہ اہل الروایۃ اور اہل الحدیث اور دوسرا فرقہ مجتہد اور اہل الرائے کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔ امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی اسی لیے اہل الرائے کہلائے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ مجتہد مستقل اور بانی مذہب تھے، لیکن چونکہ ان لوگوں میں بھی معلومات حدیث اور قوتِ اجتہاد کے لحاظ سے اختلاف مراتب تھا، اس لیے اضافی طور پر کبھی کبھی اس فرقے میں سے ایک کو اہل الرائے اور دوسرے کو اہل حدیث کہتے تھے، مثلاً امام مالک کی بہ نسبت امام ابوحنیفہ پر مجتہد اور اہل الرائے کا لقب زیادہ موزوں تھا، امام احمد حنبل سے ایک بار نضر بن یحییٰ نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو ابوحنیفہ پر کیا اعتراض ہے ؟" انہوں نے جواب دیا کہ رائے" نضر نے کہا کیا امام مالک رائے پر نہیں عمل کرتے" امام احمد بن حنبل بولے کہ ہاں لیکن ابوحنیفہ رائے کو زیادہ دخل دیتے ہیں، نضر نے کہا تو حصّہ رسدی کے موافق دونوں پر الزام آنا چاہیے" نہ صرف ایک پر امام احمد بن حنبل کچھ جواب نہ دے سکے اور چپ ہو گئے ۔

امام صاحب کے اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونے کی وجہ

امام ابوحنیفہ سے پہلے فقہ

---

[1] عقود الجمان خاتمہ فصل اول

کوئی مستقل اور مرتب فن نہ تھا، امام صاحب نے جب اس کی تدوین کی تو ہزاروں مسئلے ایسے پیش آئے جن میں کوئی حدیث صحیح بلکہ صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا، اس لیے ان کو قیاس سے کام لینا پڑا، قیاس پر پہلے بھی عمل تھا، خود صحابہ قیاس کرتے تھے۔ اور اس کے مطابق فتوے دیتے تھے (اس کا مفصّل بیان آگے آئے گا) لیکن اس وقت تک تمدن کو چنداں وسعت حاصل نہ تھی، اس لیے نہ کثرت سے واقعات پیش آتے تھے، نہ چنداں قیاس کی ضرورت پڑتی تھی، امام صاحب نے فقہ کو مستقل فن بنانا چاہا۔ قیاس کی کثرت استعمال کے ساتھ اس کے اصول و قواعد بھی مرتب کرنا پڑے، اس بات نے ان کو رائے اور قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت دی، چنانچہ تاریخوں میں جہاں ان کا نام لکھا جاتا ہے۔ امام اہل الرائے لکھا جاتا ہے۔

ایک اور وجہ

اس شہرت کی ایک اور وجہ ہوئی، عام محدثین، حدیث در روایت میں درایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے، امام ابو حنیفہ نے اس کی ابتدا کی اور اس کے اصول و قواعد منضبط کیے، انھوں نے بہت سی حدیثیں اس بنا پر قبول نہ کیں کہ اصول درایت کے موافق ثابت نہ تھیں، اس لیے اس لقب کو زیادہ شہرت ہوئی، کیونکہ درایت اور رائے مترادف سے الفاظ ہیں اور کم از کم یہ کہ عام لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

ان عارضی بحثوں کے بعد ہم اصل مسئلہ پر متوجہ ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ امام ابو حنیفہ کو فن حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا، اس بحث کے فیصلے کے لیے ان کی علمی زندگی کے ان واقعات پر نظر ڈالنی چاہئے، جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں، اس کتاب میں ہم امام ابو حنیفہ کی تحصیل حدیث کے حالات ان کتابوں کی سند سے لکھ آئے ہیں، جن پر فن رجال کا دار و مدار ہے۔ اب غور کرو۔ کہ جس شخص نے بیس برس کی عمر سے جو فہم کی درستی اور پختگی کا زمانہ ہے۔ علم حدیث پر توجہ کی ہو اور ایک مدت تک اس شغل میں مصروف رہا ہو۔

جس نے کوفہ کے مشہور شیوخِ حدیث سے حدیثیں سیکھی ہوں، جو حرم محترم کی درسگاہوں میں تحصیل حدیث کرتا رہا ہو، جس کو مدینہ منوّرہ کے شیوخ نے سندِ فضیلت دی ہو۔ جس کے اساتذہ حدیث عطا بن ابی رباح، نافع ابن عمر دینار، محارب بن وثار، اعمش کوفی، امام باقر، علقمہ بن مرثد، مکحول شامی، امام اوزاعی، محمد بن مسلم الزہری، ابواسحٰق السبیعی۔ ار سلیمان بن یسار، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، منصور المعتمر، ہشام بن عروہ وغیرہ ہوں جو فنِ روایت کے ارکان ہیں اور جن کی روایتوں سے بخاری و مسلم مالامال ہیں۔ وہ حدیث میں کس رتبہ کا شخص ہوگا۔

اس کے ساتھ امام صاحب کے شاگردوں پر لحاظ کرو[1] یحییٰ بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں، عبدالرزاق بن ہمام جن کی جامع کبیر سے امام بخاری نے فائدہ اٹھایا ہے، یزید بن ہارون جو امام احمد بن حنبل کے استاد تھے، وکیع بن الجراح جن کی نسبت امام احمد بن حنبل کہا کرتے تھے، کہ حفظ اسناد روایت میں میں نے ان کا ہمسر کسی کو نہیں دیکھا، عبداللہ بن المبارک جو فنِ حدیث میں امیر المومنین تسلیم کئے گیے ہیں، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ جن کو علی بن المدینی (اُستاد بخاری) منتہائے علم کہا کرتے تھے، یہ لوگ برائے نام امام صاحب کے شاگرد نہ تھے، بلکہ برسوں ان کے دامنِ فیض میں تعلیم پائی تھی، اور اس انتساب پر ان کو فخر و ناز تھا۔ عبداللہ بن المبارک کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے ابوحنیفہ و سفیان ثوری سے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں ایک معمولی آدمی ہوتا[2]، وکیع اور یحییٰ بن ابی زائدہ امام صاحب کی صحبت میں اتنی مدت تک رہے تھے کہ صاحب ابی حنیفہ کہلاتے تھے، کیا اس رتبہ کے لوگ جو خدمت حدیث اور روایت کے پیشوا اور مقتدا تھے کسی معمولی شخص کے سامنے سر جھکا سکتے تھے۔

---

[1] ان لوگوں کا تذکرہ اس کتاب کے خاتمہ پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

[2] ترتیب التہذیب ترجمہ امام ابوحنیفہ

اجتہاد کی شرط اور امام ابو حنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا

ان باتوں کے علاوہ امام ابو حنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا ایک ایسا مسلّم مسئلہ ہے، جس سے بارہ سو برس کی مدت میں شاید ایک آدھ ہی شخص نے انکار کیا ہو، اجتہاد کی تعریف علمائے حدیث مثلاً بغوی رافعی علامہ نووی وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے۔ مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن حدیث مذاہب سلف، لغت، قیاس (۵) پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، یعنی مسائل شریعہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں، جو حدیثیں رسول اللہ (صلعم) سے ثابت ہیں، جس قدر علم لغت درکار ہے۔ سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طریق ہیں قریب قریب کل کے جانتا ہو، اگر ان میں سے کسی میں کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہیے۔

اسی بنا پر علامہ ابن خلدون نے فصل علوم الحدیث میں مجتہدین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ بعض ناانصاف مخالفین کا قول ہے کہ ان مجتہدوں میں سے بعض فنِ حدیث میں کم مایہ تھے۔ اس لیے ان کی روائتیں کم ہیں، لیکن یہ خیال غلط ہے، کہ ائمہ کبار کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ شریعت قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے پس جو شخص حدیث میں کم مایہ ہے۔ اس کو تلاش اور کوشش کرنی چاہیے تاکہ دین کو اصول صحیحہ سے اخذ کر سکے"۔ اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں، کہ فنِ حدیث میں امام ابو حنیفہ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے اور رداً و قبولاً" اس سے بحث کی جاتی ہے[1]۔ علامہ موصوف نے اس کا سبب بھی بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی روائتیں کم کیوں ہیں۔ ہم خود اس کو مفصل لکھیں گے۔

---

[1] تعجب ہے کہ اس تصریح کے ہوتے ہوئے بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحب کی ناواقفیت حدیث پر ابن خلدون کے ایک ضمنی قول سے استدلال کیا ہے، جس کو خود ابن خلدون نے ایسے لفظوں سے بیان کیا ہے، جو ضعف اور عدم وثوق پر دلالت کرتا ہے۔

محدث ذہبی نے امام ابوحنیفہ کو حفاظِ حدیث میں محسوب کیا ہے

محدثین میں بھی اکثروں نے اس کا اعتراف کیا ہے، علامہ ذہبی نے جو زمانہ مابعد کے تمام محدثین کے پیشوا اور امام ہیں حفاظِ حدیث کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے۔ جو علم نبوی کے حامل ہیں اور جن کے اجتہاد پر توثیق اور تضعیف تصحیح وتزییف میں رجوع کیا جاتا ہے۔ علامہ موصوف نے تمام کتاب میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے، اور کسی ایسے شخص کا حال نہیں لکھا جو علم حدیث کا بڑا ماہر نہ ہو، چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت کا ضمناً ایک موقع پر ذکر آگیا ہے تو لکھتے ہیں۔ کہ میں نے ان کو حفاظِ حدیث میں اس لیے ذکر نہیں کیا کہ وہ قلیل الحدیث تھے، امام ابوحنیفہ کے محدّث ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہے کہ علامہ ذہبی نے اس کتاب میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔

حافظ ابوالمحاسن دمشقی وشافعی نے عقود الجمان میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔ الباب الثالث والعشرون فی بیان کثرۃ حدیثہ وکونہ من اعیان الحفاظ المحدثین یعنی "تیسواں باب اس بیان میں کہ وہ (امام ابوحنیفہ) کثیر الحدیث اور اعیان الحفاظ سے تھے" قاضی ابویوسف صاحب جن کو یحییٰ بن معین صاحب الحدیث کہتے تھے، اور علامہ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں محسوب کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ ہم لوگ امام ابوحنیفہ سے مسائل میں بحث کرتے ہوتے تھے، جب ان کی رائے قائم ہو جاتی تھی۔ تو میں حلقۂ درس سے اُٹھ کر کوفہ کے محدثین کے پاس جاتا تھا۔ اور ان سے مسئلہ کے متعلق حدیثیں دریافت کر کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ امام صاحب ان حدیثوں میں سے بعض کو قبول کرتے تھے، اور بعض کو فرماتے تھے کہ صحیح نہیں میں پوچھتا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرماتے کہ "کوفہ میں جو علم ہے میں اس کا عالم ہوں"۔

یہ تمام باتیں اس بات کی ہیں کہ علم حدیث میں امام ابو حنیفہ کا کیا پایہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے امام ابو حنیفہ کو امام ابو حنیفہ نہیں بنایا اگر وہ حافظ الحدیث تھے، تو اور لوگ بھی تھے، اگر ان کے شیوخ حدیث کئی سو تھے تو بعض آئمہ سلف کے شیوخ کئی کئی ہزار تھے۔ اگر انہوں نے کوفہ وحرمین کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ تو اوروں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا، امام ابو حنیفہ کو جس بات نے تمام ہمعصروں میں امتیاز دیا اور چیز ہے، جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق۔ امام ابو حنیفہ کے بعد علم حدیث کو بہت ترقی ہوئی، غیر مرتب اور پریشان حدیثیں یکجا کی گئیں، صحاح کا التزام کیا گیا، اصول حدیث کا مستقل فن قائم ہوگیا۔ جس کے متعلق سینکڑوں بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں، زمانہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ باریک بینی اور وقت آفرینی کی حد نہیں رہی تجربہ اور وقّتِ نظر نے سینکڑوں نئے نکتے ایجاد کئے، لیکن تنقید احادیث، اصول روایت، امتیاز مراتب میں امام ابو حنیفہ کی تحقیق کی جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس اجمال کی تفصیل اس وقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ فنِ حدیث کے آغاز اور طرز ترقی کا اجمالی نقشہ کھینچا جائے، جس سے ظاہر ہو کہ روایتوں کا سلسلہ کیونکر پیدا ہوا اور کس کس دور میں اس کی کیا کیا حالتیں بدلیں، اسی سے ایک بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ احادیث کی تنقید میں اجتہاد رائے کا کس قدر کام ہے، اور امام ابو حنیفہ کو اس لحاظ سے اپنے تمام فنون میں کیا خاص امتیاز حاصل ہے۔

سلسلہ حدیث کی مختصر تشریح

اسناد وروایت کا سلسلہ اگرچہ رسول اللہ (صلعم) کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو چکا تھا، لیکن اس وقت تک جس قدر تھا۔ نہایت سادہ اور قدرتی صورت میں تھا، آغاز نبوت سے تیرہ برس کا زمانہ تو ایسا پرآشوب زمانہ تھا کہ اپنی اپنی جان کی پڑی تھی اسناد وروایت

کا کہاں موقع تھا، اسی ضرورت سے احکام و فرائض بھی کم تھے، یعنی نماز کے سوا اور کچھ فرض نہ ہوا تھا، کیونکہ اس زحمت میں اور فرائض کی تکلیف، تکلیف مالا یطاق سے کم نہ تھی، نمازیں بھی مختصر تھیں۔ یعنی ظہر، عصر، عشا سب میں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں، جمعہ و عیدین سرے سے مامور بہ نہ تھے، ۲ھ یعنی نبوت سے تیرھویں برس روزے فرض ہوئے، زکوٰۃ کی نسبت اختلاف ہے، علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے۔ کہ ۹ھ میں فرض ہوئی، حج کا حکم بھی اسی سنہ میں ہوا، غرض آغاز نبوت سے ایک مدت تک نماز کے سوا نہ اور احکام صادر ہوئے تھے، نہ ان کے متعلق حدیثیں اور روایتیں پیدا ہوئی تھیں، صحابہ مسائل و احکام کے متعلق زیادہ پرسش و جو نہیں کرتے تھے، خود قرآن میں حکم آچکا تھا۔ لَاتَسْئَلُوْعَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ

عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے، کہ میں نے رسول اللہ (صلعم) کے اصحاب سے کسی قوم کو بہتر نہیں دیکھا، تمام زمانہ نبوت میں صرف تیرہ مسئلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے، جو سب قرآن میں مذکور ہیں[۱] اور صحابہ سے بھی اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔

جو احکام اور واقعات پیش آتے تھے، ان میں روایت کا سلسلہ کم جاری ہوا تھا۔ صحابہ خود رسول اللہ (صلعم) سے پوچھ لیا کرتے تھے اور واسطہ و روایت کی کم ضرورت پڑتی تھی۔ حدیثوں کے قلم بند کرنے کی اجازت نہ تھی، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ رسول اللہ (صلعم) کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شروع ہوئی، ابتدا ہی میں عرب کی بغاوتِ عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر روم، ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں اور ان کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی، حضرت عمرؓ نے سات برس خلافت کی اور ملک میں نہایت امن و امان رہا، لیکن وہ دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے حدیث بیان کرنے والا رسول اللہ کی

حضرت عمرؓ کثرتِ روایت سے روکتے تھے

طرف، غلط روایت منسوب نہ کر دے، صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے۔ کہ حدیثیں کم بیان کیا کریں[1]" ایک بار انصار کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا، چلتے وقت ان سے فرمایا کہ تم لوگ کوفہ جا رہے ہو، وہاں ایک قوم سے ملو گے جو بڑی رقت سے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، وہ تمہاری آمد سن کر مشتاق ہوں گے۔ کہ رسول اللہ (صلعم) کے اصحاب آئے ہیں، لیکن جب وہ تمہارے پاس آئیں اور حدیثیں سننی چاہیں تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا[2]۔ اسی طرح عراق کو صحابہ جانے لگے تو حضرت عمر نے خود ان کی مشایعت کی اور ان سے پوچھا کہ "جانتے ہو میں کیوں تمہارے ساتھ آ رہا ہوں" لوگوں نے کہا تکرمۃ علینا" یعنی ہماری عزت افزائی کے لیے فرمایا کہ ہاں لیکن ایک اور مقصد ہے، وہ یہ کہ جہاں جا رہے ہو وہاں کے لوگ اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔ ان کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا اور رسول اللہ (صلعم) سے کم روایت کرنا" چنانچہ جب یہ لوگ قرظہ پہنچے تو لوگ یہ سن کر کہ صحابہ تشریف لائے ہیں۔ زیارت کو آئے اور حدیثوں کی خواہش ظاہر کی، ان لوگوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے[3]

حضرت ابوہریرہؓ سے ابوسلمہ نے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے بولے کہ "نہیں ورنہ عمر درے مارتے[4]"

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کی مجموعی خلافت بیس اکیس برس تک رہی۔ اس میں احادیث کی زیادہ اشاعت ہوئی، صحابہ دور دور پہنچ گئے تھے، ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں، نئے نئے مسئلے پیش آتے، ان اسباب نے حدیث و روایت کے سلسلے کو بہت وسعت دی، حضرت عثمان کے اخیر زمانہ میں بغاوت ہوئی۔ جس کا خاتمہ خلیفہ وقت کی شہادت پر ہوا، اور یہ

---

[1] طبقات الحفاظ ترجمہ حضرت عمرؓ

[2] مسند داری

[3] طبقات الحفاظ ترجمہ عمر فاروق

[4] ایضاً

پہلا موقع تھا، کہ جماعت اسلام میں فرقہ بندیاں قائم ہوئیں۔

حدیثوں کا وضع کیا جانا

حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہی سے پر آشوب رہی ان اختلافات اور فتن کے ساتھ وضع احادیث کی ابتدا ہوئی، اور اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانہ مابعد میں ہوا، لیکن خود صحابہ کے عہد میں اہل بدعت نے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کرلی تھیں (مقدمہ صحیح مسلم میں ہے۔ کہ ایک بار بشیر عدوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی، انہوں نے کچھ خیال نہ کیا، بشیر نے کہا ابن عباس ہیں رسول اللہ سے روایت کر رہا ہوں اور تم متوجہ نہیں ہوتے" فرمایا کہ ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسی کو قال رسول اللہ کہتے سنتے تو فوراً ہماری نگاہیں اٹھ جاتی تھیں اور کان لگا کر سنتے تھے، لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی، ہم صرف ان حدیثوں کو سنتے ہیں جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں"۔

زبانی روایت سے گذر کر تحریروں میں بھی جعل شروع ہو گیا تھا۔ مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے، بیچ بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ "واللہ علیؓ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہو گا۔ اسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت علیؓ کی ایک تحریر دیکھی تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی عبارت مٹادی۔

وضع حدیث اور روایت میں بے احتیاطی کے اسباب

لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اس وجہ سے ہوتی تھی کہ اس وقت تک اسناد و روایت کا طریقہ جاری نہیں ہوا تھا جو شخص چاہتا تھا قال رسول اللہ کہہ دیتا تھا اور اثبات سند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا، ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے، جب فتنہ پیدا ہوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی، تاکہ اہل سنت کی حدیثیں لی جائیں

اور اہل بدعت کی ترک کی جائیں، لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی اس لئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بنو امیہ کا دور شروع ہوا اور بڑے زور شور سے حدیث نے ترویج پائی۔ صحابہ کی تعداد جس قدر کم ہوتی جاتی تھی، اسی قدر ان کی قدر اور ان کی طرف التفات بڑھتا جاتا تھا۔ تمدن میں کچھ ترقی ہوگئی تھی، نئی نئی قومیں مسلمان ہوتی جاتی تھیں، ان نومسلموں کو ادھر تو اسلام کا نیا جوش تھا، ادھر قوم فاتح کے مجمع میں عزت واثر پیدا کرنے کی اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہ تھی، ان باتوں نے ان کو معلومات مذہبی کا اس قدر شائق بنا دیا تھا کہ خود عرب ان کی ہمسری کا دعوٰے نہیں کر سکتے تھے، غرض تمام ممالک اسلامیہ میں گھر گھر حدیث و روایت کے چرچے تھے اور سینکڑوں ہزاروں درسگاہیں قائم ہوگئیں۔

لیکن جس قدر اشاعت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی، اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا، ارباب روایت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا، کہ اس میں مختلف خیال مختلف عادات، مختلف عقائد، مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے، اہل بدعت جابجا پھیل گئے تھے، اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے، سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گذر جانے پر بھی کتابت کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا۔ ان اسباب سے روائتوں میں اس قدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغالیط کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہوگیا۔ یہاں تک کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ میں صحیح حدیثوں کا جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی، جس میں کُل ۷،۳۹۷ حدیثیں ہیں، ان میں بھی اگر مکررات نکال ڈالی جائیں تو صرف ۲،۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں۔

زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں اور ایک شخص نے چار ہزار حدیثیں وضع کیں

سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کر لیں، حماد بن زید

کا بیان ہے، کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ ازنادقہ نے وضع کر لیں[1]، عبدالکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا۔ کہ چار ہزار حدیثیں اس کی موضوعات سے ہیں[2]، بہت سے ثقات اور پارسا تھے، جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کر لیتے تھے، حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں، کہ اُن حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ ان واضعین کے تثقہ اور تورع وزہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہو گئیں اور رواج پا گئیں"۔

وضع کے بعد مساہلات، غلط فہمیوں، بے احتیاطیوں کا درجہ تھا، جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول اللہ صلعم کی طرف بے قصد منسوب ہو گئے، بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ حدیث کے ساتھ تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے، اور اکثر حروف تفسیر حذف کر دیتے تھے، جس سے سامعین کو دھوکا ہوتا تھا، اور وہ ان کے تفسیری جملوں کو حدیث مرفوع سمجھ لیتے تھے، تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ائمہ فن سے صادر ہوئے، امام زہری جو امام مالک کے اُستاد اور حدیث کے ایک بڑے رُکن تھے، ان کی نسبت علامہ سخاوی لکھتے ہیں۔ وکذا کان الزھری تفسیرا لحدیث کثیرا وربما اسقط اداۃ التفسیر، یعنی اسی طرح زہری اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے، اور وہ حرف جن سے اس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو چھوڑ دیا کرتے تھے"۔ وکیع کا بھی یہی حال تھا، وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں "یعنی" کہہ کر مطلب بیان کرتے جاتے تھے، اور اکثر "یعنی" کا لفظ چھوڑ دیتے تھے، جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا، کتب رجال واصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

تدلیس وتلبیس

بڑی آفت تدلیس کی تھی، جس کا ارتکاب بڑے بڑے ائمہ فن کرتے تھے، اس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا، ان کے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں، جن کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔

غرض امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں احادیث کا جو دفتر تیار ہو چکا تھا۔ ہزاروں موضوعات اغالیط، ضعاف، مدرجات سے بھرا ہوا تھا، اس وقت امام بخاری و مسلم نہ تھے، جو صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کرتے، امام ابوحنیفہ گو مہمات فقہ کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہ ہو سکے تاہم انہوں نے روایتوں کی تنقید کی بنیاد ڈالی اور اس کے اصول وضوابط قرار دیئے، ان کے اصولِ تنقید نہایت سخت خیال کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ محدثین نے ان کو مشدد فی الروایۃ کا لقب دیا ہے، تمام اور محدثین کی بہ نسبت امام صاحب کے قلیل الروایہ ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے بلکہ تمام اور وجوہ کی بہ نسبت یہ زیادہ قوی سبب ہے، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔ والامام ابوحنیفہ انما قلت روایته لما شدد فی شروط الروایة و التحمل یعنی امام ابوحنیفہ کی روائیتیں اس لیے کم ہیں کہ انہوں نے روایت اور تحمل کی شروط میں سختی کی۔

حدیث کے متعلق پہلا اجمالی خیال جو امام صاحب کے دل میں پیدا ہوا، وہ یہ تھا، کہ بہت کم حدیثیں ہیں جو صحیح ہیں یا کہ بہت حدیثیں ہیں جن کی صحت کا کافی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ صدا اگرچہ جدت کی وجہ سے کسی قدر نا مانوس صدا تھی اور اسی وجہ سے بعض ارباب حدیث نے نہایت سخت مخالفت کی، لیکن امام صاحب اس خیال پر مجبور بلکہ معذور تھے، انہوں نے یہ رائے مقلدانہ نہیں قائم کی تھی۔ وہ اپنے زمانہ کے اکثر شیوخ سے ملے تھے اور ان کے سرمایۂ حدیث سے متمتع ہوئے تھے، حرمین کی بڑی بڑی درسگاہوں میں برسوں تعلیم پائی تھی، کوفہ، بصرہ، حرمین میں ارباب روایت کا جو گروہ موجود تھا، برسوں کے تجربے سے ان کے ذاتی اوصاف، اخلاق و عادات پر اطلاع حاصل کی تھی، غرض اس مسئلہ کے متعلق اثباتاً یا نفیاً مجتہدانہ رائے قائم کرنے کے لیے جو شرطیں درکار تھیں، سب ان میں موجود تھیں۔

امام صاحب کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں

اس خیال کا ایک بڑا سبب

اس خیال کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی پیرایہ میں ان کے خاندانِ تعلیم میں وراثۃً چلا آتا تھا، حدیث و فقہ میں ان کے خاندانِ تعلیم کے مورثِ اوّل عبداللہ بن مسعود رضؓ ہیں اور مذہب حنفی کی بنیاد زیادہ تر انہی کی روایات و استنباط پر ہے، عبداللہ بن مسعود رضؓ اگرچہ بہت بڑے محدّث تھے، لیکن اور محدثین صحابہ کی نسبت قلیل الروایۃ تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متشدّد اور محتاط تھے، علامہ ذہبی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایۃ وکان یقل من الروایۃ الحدیث یعنی عبداللہ بن مسعودؓ ادا میں تحریری اور روایت میں تشدد کرتے تھے۔ اور حدیث کی روایت کم کرتے تھے۔ ابراہیم نخعی جو عبداللہ بن مسعودؓ کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے بہ یک واسطہ استاد تھے۔ ان کا بھی یہی مذہب تھا، اور اسی وجہ سے وہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہ نے گو اور بہت درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی لیکن ان کی معلومات اور خیالات کا اصلی مرکز یہی خاندانی اثر تھا جس نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا اور اس کو ان کے ذاتی تجربہ اور دقت نظر نے اور بھی قوت دی۔

امام مالکؒ و امام ابوحنیفہ کی شروط روایت قریب متحد ہیں

امام صاحب کے اس خیال نے اگرچہ قبول عام کی سند حاصل نہیں کی لیکن وہ بالکل بے اثر نہیں رہا۔ امام مالک و امام شافعی جو اجتہاد میں امام ابوحنیفہ سے متاخر ہیں۔ ان کے اصول اجتہاد میں اس خیال کا صاف پرتو پایا جاتا ہے۔ امام مالک نے روایت کے متعلق جو قید اور شرطیں لگائی ہیں۔ وہ امام ابوحنیفہ کے شرائط کے قریب قریب ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ متشددین فی الروایۃ میں امام ابوحنیفہؒ و امام مالک کا نام ساتھ لیا جاتا ہے، ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ د من مذاھب التشدید مذھب من قال لا حجۃ الا فیما روایۃ الراوی من حفظہ و

تذکرہ و ذالک مروی عن مالک و ابی حنیفہ یعنی "مشددین کا یہ مذہب ہے کہ صرف وہ حدیث قابل حجت ہے، جس کو راوی نے اپنے حفظ سے یاد رکھا ہے اور یہ قول مالک و ابو حنیفہ سے منقول ہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ امام مالک نے اول جب مؤطا لکھی تو اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں، پھر امام مالک زیادہ تحقیق کرنے لگے تو یہ تعداد کم ہوتی گئی یہاں تک کہ چھ سات سو رہ گئی، امام شافعی نے صاف لفظوں میں امام ابو حنیفہ کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔

امام شافعی کا قول تھا کہ صحیح حدیثیں بہت کم ہیں

امام بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک دن ایک قرشی نے امام شافعی سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوائیے جو رسول اللہ (صلعم) سے ثابت ہیں انہوں نے جواب دیا کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں، کیونکہ ابوبکر صدیقؓ نے جو حدیثیں رسول اللہ (صلعم) سے روایت کی ہیں ان کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے، عمر بن الخطابؓ باوجود اس کے رسول اللہ (صلعم) کے بعد مدت تک زندہ رہے ان کی روایت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں، حضرت عثمانؓ کا بھی یہی حال ہے، حضرت علی اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے، لیکن ان سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں۔ کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے، ان سے جو حدیثیں مروی ہیں۔ اکثر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کی ہیں۔ ان لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ روائتیں صحیح سند سے ثابت نہیں ہیں[1]۔

امام صاحب نے روایت کیلئے کیا شرطیں مقرر کیں

ان باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام ابو حنیفہ معتزلہ کی طرح احادیث کے منکر تھے، یا صرف دس بیس حدیثوں کو تسلیم کرتے

---

[1] مناقب الشافعی از امام رازی فصل ثامن شرح مذہب شافعی۔

تھے، ان کے شاگردوں نے خود ان سے سینکڑوں حدیثیں روایت کی ہیں مؤطا امام محمد کتاب الآثار، کتاب الحج جو عام طور پر متداول ہیں، ان میں بھی امام صاحب سے بیسیوں حدیثیں مروی ہیں، البتہ اور محدثین کی نسبت ان کی احادیث مسلمہ کی تعداد کم ہے۔ اور اس کی وجہ وہی شروط روایت کی سختی ہے۔ امام صاحب نے روایت کے متعلق جو شرطیں اختیار کیں کچھ تو وہی ہیں جو اور محدثین کے نزدیک مسلم ہیں۔ کچھ ایسی ہیں۔ جن میں وہ منفرد ہیں یا صرف امام مالک اور بعض اور مجتہدین ان کے ہم زبان ہیں۔

ان میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ "صرف وہ حدیث حجت ہے، جس کو راوی نے اپنے کان سے سنا ہو، اور روایت کے وقت تک یاد رکھا ہو"۔ یہ قاعدہ بظاہر نہایت صاف ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کی تفریعیں نہایت وسیع اثر رکھتی ہیں۔ اور عام محدثین کو ان سے اتفاق نہیں ہے۔ محدثین کے نزدیک ان پابندیوں سے روایت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اور اس سے ہم کو بھی انکار نہیں، لیکن اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ احتیاط مقدم ہے، یا روایت کی وسعت ہم بعض تفریعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ امام ابو حنیفہ کو کس خیال نے اس قسم کی سختیوں پر مجبور کیا تھا۔

اکثر شیوخ کا حلقہ درس نہایت وسیع ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار سامعین جمع ہوتے تھے، اس وقت متعدد مستملی یعنی نائب جا بجا بٹھائے جاتے تھے، کہ شیخ کے الفاظ کو دور والوں تک پہنچائیں، بہت سے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کے کانوں میں شیخ کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ صرف مستملی کے الفاظ سن کر حدیث روایت کرتے تھے، اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف مستملی سے سنا وہ اصل شیخ کی نسبت حدثنا کہہ سکتا ہے یا نہیں، اکثر ارباب روایت کا مذہب ہے کہ کہہ سکتا ہے، امام ابو حنیفہ اس کے خلاف ہیں، ائمہ محدثین میں سے حافظ ابو نعیم، فضل بن وکیع

زائدہ بن کدامہ، امام صاحب کے ہم زبان ہیں[1]۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا کہ مقتضائے عقل یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، لیکن علم مذہب میں آسانی ہے۔

امام ابوحنیفہ کو اس احتیاط پر جس چیز نے مجبور کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ ان کے زمانہ تک روائت بالمعنی کا طریقہ نہایت عام تھا اور بہت کم لوگ تھے، جو الفاظِ حدیث کی پابندی کرتے تھے، اس لئے روایت میں تغیر و تبدل کا احتمال ہر واسطہ میں بڑھتا جاتا تھا، کم از کم یہ کہ ہر روایت پہلے واسطہ میں جس قدر قوی ہوتی ہے دوسرے واسطہ میں اس کا وہ پایہ نہیں قائم رہ سکتا تھا، بے شبہ مستملی کے کام کرنے کا طریقہ قائم رکھنا ضروری تھا، کیونکہ اکثر موقعوں پر بغیر مستملی کے کام نہیں چل سکتا تھا، لیکن ناانصافی تھی کہ جس شخص نے بلاواسطہ شیخ سے سنا ہو اور جس نے مستملی سے روایت کی ہو، دونوں کا ایک ہی درجہ قرار دیا جائے، مستملی کبھی کبھی نہایت غافل بے سمجھ ہوتے تھے، اس لئے غلطیوں کا احتمال اور بھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

اس طرح بلکہ اس سے زیادہ غیر محتاط طریقہ یہ تھا کہ اخبرنا و حدثنا کو بعض محدثین نہایت عام معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ امام حسن بصری نے متعدد روایتوں میں کہا ہے حدثنا ابو ھریرہ حالانکہ وہ ابوہریرہ سے کبھی نہیں ملے تھے۔ انہوں نے اس کی یہ تاویل کی تھی کہ ابوہریرہ نے جب وہ حدیث بیان کی تھی تو اس شہر میں وہ موجود تھے۔

"حدثنا" کا مفہوم اور اس کا استعمال

اسی طرح اور شیوخ و صحابہ کی نسبت حدثنا کا لفظ استعمال کرتے تھے اور معنی یہ لیتے تھے کہ ان کے شہر والوں نے ان شیوخ سے سنا تھا۔ محدث بزار نے لکھا ہے کہ حسن بصری نے ان لوگوں سے روایت کی ہے، جن سے وہ کبھی نہیں ملے اور تاویل یہ کرتے تھے، کہ ان کی قوم نے وہ حدیث ان لوگوں سے سنی تھی۔ یہ امر علاوہ اس کے کہ ایک قسم کی

---

[1] فتح المغیث صفحہ ۱۸۷، ۱۱۸ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۸ [3] فتح المغیث صفحہ ۱۷۱

غلط بیانی تھی، حدیث کی اسناد کو مشتبہ کر دیتا تھا۔ کیونکہ راوی نے جب خود شیخ سے حدیث نہیں سنی تو بیچ میں کوئی واسطہ ہوگا۔ اور چونکہ راوی نے اس کا نام نہیں بتایا۔ اس لیئے اس کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے کا حال نہیں معلوم ہو سکتا۔ صرف حسن ظن پہ مدار رہ گیا۔ ایسے شخص نے جس سے سنا ہوگا۔ وہ ضرور قابلِ استناد ہوگا۔ امام ابو حنیفہ نے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیا۔ اور ان کے بعد اور ائمہ حدیث نے بھی ان کی متابعت کی۔

ارباب روایت کا ایک یہ طریقہ تھا کہ جب کسی شخص سے کچھ حدیثیں سنیں اور قلمبند کرلیں تو ان اجزا سے روایت کرنی ہمیشہ جائز سمجھتے تھے۔ اس کو اس قدر وسعت دی گئی کہ راوی کو ان حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ یاد نہ رہے ہوں۔ تاہم اس بنا پہ کہ اجزا اس کے پاس موجود ہیں۔ ان کی روایت کر سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس طریقہ کو قائم رکھا، لیکن یہ قید لگائی کہ حدیث کے الفاظ و مطالب محفوظ ہونے چاہئیں ورنہ روایت جائز نہیں۔

یہ مسئلہ بھی اگرچہ عام طور پر نہیں تسلیم کیا گیا، تاہم جیسا کہ محدث سخاوی نے تصریح کی ہے۔ امام مالک اور بہت سے ائمہ فن نے اس کی موافقت کی۔ امام بخاری و مسلم کے زمانہ میں اس قید کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت روایت باللفظ کا عام رواج ہو چکا تھا۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے عہد تک حدیثیں زیادہ تر بالمعنی روایت کی جاتی تھیں۔ اس لیے اگر راوی کو الفاظ حدیث، موقع حدیث، شانِ نزول وغیرہ یاد نہیں ہوتے تھے تو روایت کا بعینہا ادا کرنا قریباً ناممکن ہوتا تھا۔ اسی ضرورت سے امام ابو حنیفہ نے اس طریقہ کو محدود کر دیا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

روایت بالمعنی

سب سے زیادہ مہتم بالشان اور قابلِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ ایسی روایت قطعاً قابلِ حجت ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ امام شافعی نے روایت کی ہے کہ بعض تابعین نے ایک حدیث متعدد صحابہ سے سنی جس کو سب نے مختلف لفظوں میں بیان کیا۔ لیکن مطلب

ایک تھا۔ انہوں نے کسی صحابی سے یہ حقیقت بیان کی، صحابی نے جواب دیا کہ جب مختلف نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں مگر امام شافعی نے تابعی کا نام نہ بتایا جس سے روایت کی قوت اور ضعف کا اندازہ ہو سکتا، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صحابہ روایت بالمعنی جائز سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے، بخلاف اس کے بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کو روایت باللفظ پر اصرار تھا۔

روایت بالمعنی میں صحابہ کی احتیاط

علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ " وہ روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو زجر کرتے تھے کہ الفاظ کے ضبط میں بے پروائی نہ کریں۔ عبداللہ بن مسعود جب کبھی بالمعنی روایت کرتے تھے او مثلہ، او نحوہ اور شبیہ بہ اَمّا فوق ذالک، و اما دون ذالک و اَمّا قریب من ذالک۔ یعنی رسول اللہ نے اس طرح فرمایا تھا یا اس کے مثل یا اس کے مشابہ یا اس سے کچھ زیادہ یا کم یا اس کے قریب قریب فرمایا تھا۔ ابوالدردا کا بھی یہی حال تھا۔ وہ حدیث بیان کر کے کہا کرتے تھے ھذا او نحو ھذا او شکلہ[1]۔ حضرت عمرؓ جو لوگوں کو روایت حدیث سے منع کیا کرتے تھے ان کا بھی غالباً یہی منشا تھا، وہ جانتے تھے کہ الفاظ کم یاد رہ سکتے ہیں اور معنی کی عام اجازت میں تغیّر و تبدّل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔

صحابہ کے دَور کے بعد بھی یہ مسئلہ یک سونہ ہوا۔ تابعین کے دو گروہ تھے۔ اور خود امام ابوحنیفہ کے استاد الاستاد روایت بالمعنی کے قائل تھے۔ آگے چل کر تو گویا اس پر اتفاق عام ہو گیا کہ روایت بالمعنی جائز ہے۔ چنانچہ اصول حدیث کی کتابوں میں جمہور کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے۔ مجتہدین میں سے صرف امام مالک اس کے خلاف ہیں۔ محدثین کا ایک گروہ جن میں، امام مسلم، قاسم بن محمد، محمد بن سیرین، رجاء بن حیواۃ، ابو زرعہ، سام بن ابی

---

[1] فتح المغیث

الجعد، عبد المالک بن عمر داخل ہیں۔ روایت باللفظ پر عمل کرتا تھا۔ لیکن عام محدثین جواز ہی کے قائل ہیں اور درحقیقت ایک ایسا فرقہ جس کا عام میلان ہر حالت میں کثرتِ روایت کی طرف ہو جواز ہی کا قائل ہو سکتا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکثر تابعین اور صحابہ نے بالمعنی حدیثیں روایت کیں۔ اور اگر شروع سے یہ قید لگائی جائے۔ تو روایت کا دائرہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ مسائل و احکام کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ روایت بالمعنی میں اصل روایت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے کہ قریباً ناممکن ہے۔ زبان کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ مرادف الفاظ بھی یکساں اثر نہیں رکھتے اور معنی کی حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مجوزین نے مرادف وغیرہ کی قید بھی نہیں رکھی اور ادائے مطلب کو نہایت عام وسعت دی ہے، صحابہ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہ (صلعم) کے الفاظ و مطالب کا اندازہ داں نہیں ہو سکتا تھا، اول تو وہ زبان داں اور زبان کے حاکم تھے۔ اس کے ساتھ شرفِ صحبت کی وجہ سے رسول اللہ کی طرزِ ادا، طریقہ گفتگو، اندازِ کلام، فحوائے سخن سے خوب واقف تھے تاہم کتب حدیث میں اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں کہ خود صحابہ سے ادائے مطلب میں کمی یا زیادتی ہو گئی۔

ادائے مطالب میں صحابہ سے کمی زیادتی

ابن ماجہ میں روایت ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ نے آنحضرت (صلعم) سے روایت کی ان المیت یعذب ببکاء الحی اذا قالوا واعضداہ واکاسباہ واناصراہ واجبلاہ یعنی "جب مردہ پر یہ الفاظ کہہ کر رویا جاتا ہے تو اس کو عذاب دیا جاتا ہے" کسی نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ ابن عمر یہ حدیث بیان کرتے تھے، حضرت عائشہؓ نے کہا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ابن عمر جھوٹ کہتے ہیں۔ لیکن ان کو سہو ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی عورت مر گئی۔ اس کے گھر والے اس پہ روتے تھے۔ آنحضرت (صلعم) نے

سنا تو فرمایا کہ اس کے گھر والے رو رہے ہیں۔ اور اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔ کہ حضرت عائشہ رض نے قرآن کی یہ آیت پڑھی لا تزر وازرۃ وزر اخری جس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے فعل کا دوسرا شخص ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ گھر والے روتے ہیں تو ان کا قصور ہے، مردہ نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس پر عذاب کیا جائے؟ دیکھو اس حدیث میں رسول اللہ نے یہودیہ عورت کا معذب ہونا بطور ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ راوی نے رونے کو اس کا سبب قرار دیا اور حدیث کے یہ الفاظ بیان کیے ان المیت یعذب ببکاء الحی یعنی "مردوں کو زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے"۔

اسی طرح غزوہ بدر کے واقعہ میں عام روایت یہ ہے کہ رسول اللہ نے قلیب پر کھڑے ہو کر فرمایا ھل وجدتم ما فعل ربکم حقا لوگوں نے عرض کی کہ "آپ مردوں سے خطاب فرماتے ہیں"۔ ارشاد ہوا کہ "جو میں نے کہا ان لوگوں نے سن لیا"۔ لیکن یہ واقعہ حضرت عائشہ کے سامنے بیان کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ الفاظ کہے تھے لقد علموا ان ما دعوتھم حق۔[1] یعنی ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز کی میں دعوت کی تھی، وہ حق ہے، دیکھو ان دونوں جملوں کے مفہوم میں کس قدر فرق ہے۔ اور اس سے سماع موتی کے مسئلہ پر کیسا مختلف اثر پڑتا ہے۔

غرض جب صحابہ سے اس قسم کے مسامحات واقع ہوتے تھے تو دوسرے اور اور تیسرے دور کا ذکر کیا۔ لطف یہ ہے کہ جو لوگ روایت بالمعنی کے قائل ہیں۔ انہوں نے چند الفاظ مثالاً بتائے ہیں کہ ان کو دوسرے لفظوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔ اور معنی میں مطلق فرق نہیں پیدا ہو گا" حالانکہ غور سے دیکھیے تو ان لفظوں کے

---

[1] تاریخ کبیر علامہ ابوجعفر جریر طبری صفحہ ۱۳۳۱

اثر میں صاف تفاوت نظر آتا ہے۔ محدث سخاوی لکھتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ اقتلوا الاسودین الحیۃ (العقرب) اب بجائے اس کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ امر بقتلھا محدث سخاوی کے نزدیک اس مثال میں الفاظ کے اختلاف نے معنی میں کچھ فرق نہیں پیدا کیا، حالانکہ اقتلوا اور امر بالقتل میں صریح تفاوت ہے۔ اقتلوا اگرچہ امر کا صیغہ ہے۔ لیکن اس میں وہ تحتم اور تاکید نہیں ہے جو اَمَرَ میں ہے۔

روایت بالمعنی کے متعلق امام ابو حنیفہ کے اصول

امام ابوحنیفہ نے ان مشکلات کا اندازہ کر کے نہایت معتدل طریقہ اختیار کیا۔ جو حدیثیں اُن کے زمانہ سے پہلے بالمعنی روایت ہو چکی تھیں اور محدثین میں شائع تھیں۔

امام صاحب نے ان حدیثوں کو قبول کیا۔ لیکن یہ قید لگائی کہ رواۃ حدیث فقیہ ہوں، یعنی الفاظ کے اثر اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں" تعبیر مطالب کا احتمال اب بھی باقی رہتا ہے۔ لیکن احادیث کا مدار (جیسا کہ محدثین نے تصریح کر دی ہے) ظن غالب پر ہے اس لیے جب تک کوئی مخالف دلیل موجود نہ ہو، روایت بالمعنیٰ قابل عمل ہو گی، امام صاحب نے ان احادیث کو بھی قبول کیا، جن کے رواۃ ثقہ ہوں اور فقیہہ نہ ہوں لیکن ان کا درجہ پہلے کی بہ نسبت کم قرار دیا۔ اور ان میں اصول درایت کی زیادہ ضرورت سمجھی، امام صاحب کے ان اصول سے اور ائمہ نے بھی اتفاق کیا۔ الفقیہ الحدیث میں ہے کہ جو شخص مدلول الفاظ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اس کو روایت باللفظ ضروری ہے البتہ جو شخص مطالب کا اندازہ دان ہے، اس کی نسبت اختلاف ہے کثرتِ رائے اس طرف ہے کہ "وہ الفاظ کا پابند نہیں"۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا۔ اور لوگوں کے لئے روایت بالالفاظ کی قید لگائی۔ اور امام طحاوی نے بسند متصل ان سے روایت کی ہے کہ صرف وہ حدیث روایت کرنی چاہیے جو روایت

کرنے کے وقت یاد تھی[1] ملا علی قاری اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ" امام ابوحنیفہؒ روایت بالمعنی کو جائز رکھتے تھے۔

اس پابندی میں اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے امام ابوحنیفہ سے اتفاق کیا فتح المغیث میں ہے۔ وقیل[2] لاتجوز الروایۃ بالمعنی مطلقاً قال لہ طائفۃ من المحدثین الفقہاء الاصولیین من الشافعیۃ وغیرھم قال القرطبی وھو الصحیح من مذھب مالک۔ لیکن عام ارباب روایت اس سختی کے کیونکر پابند ہو سکتے۔ چنانچہ ایک بڑے فرقہ نے مخالفت کی اور امام صاحب کو متشدد فی الروایۃ ٹھہرایا۔ تاہم انصاف یہ ہے۔ کہ جو اصول امام صاحب نے اختیار کیا وہ ضروری اور نہایت ضروری تھا۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ نضر اللہ امرأً اسمع منا شیئاً فبلغہ کما سمعہ یعنی رسول اللہ نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو شاداب کرے۔ جس نے ہم سے کچھ سنا اور اس کو اسی طرح پہنچایا۔ جیسا کہ ہم سے سنا تھا۔ اس سے زیادہ اس باب میں کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ روایت باللفظ کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ممکن ہے۔ کہ یہ حدیث ان کو نہ پہنچی ہو۔ چنانچہ جن صحابہ کی نسبت ثابت ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو سنا تھا۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ الفاظ کے پابند تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں یہ حدیث عام ہو چکی تھی۔ اس لئے ان کو اس کی تکمیل سے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

اصول درایت

فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہ نے یہ کیا کہ درایت کے اصول قائم کئے اور ان کو احادیث کی تحقیق وتنقید

---

[1] شرح مسند امام اعظم از ملا علی قاری صفحہ ۳

[2] یعنی کہا گیا کہ روایت بالمعنی مطلقاً جائز نہیں، محدثین وفقہا واصولیین شافعیہ کا ایک گروہ اسی قول کا قائل ہے۔ اور قرطبی نے کہا کہ امام مالک کا صحیح مذہب یہی ہے۔

میں برتا ۔ فنِ حدیث کی شاخ یعنی روایت پر ہمارے علماء نے جس قدر توجہ کی ۔ اس کی کوئی نظیر دنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں مل سکتی ۔ لیکن یہ افسوس ہے کہ اصولِ درایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا ۔ حافظ ابن حجر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں ۔ لیکن وہ اس قدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہیں ہیں ۔ اصولِ حدیث ایک مستقل فن بن گیا ہے ۔ اور بڑی بڑی کتابیں جو اس میں لکھی گئیں ۔ عموماً متداول ہیں ۔ لیکن ان سے اصول درایت کے متعلق بہت کم واقفیت ہوتی ہے ۔ حالانکہ یہی اصول فن حدیث کے نہایت ضروری اجزاء ہیں ۔ یہ عزت صرف امام ابوحنیفہ کو حاصل ہے کہ اس فن کا نام و نشان بھی نہ تھا ۔ اس وقت ان کی نگاہ ان باریک نکتوں پر پہنچی ۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درایت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابوحنیفہ کے لئے دلیل راہ بنے ، لیکن وہ باتیں عام مسائل کے ہجوم میں ایسی گم اور ناپید تھیں کہ ان پر عام لوگوں کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی ۔

روایات کی صحت و عدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار و عدم اعتبار پر نہیں ہوتا ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کی روایات جس سند سے بیان کی جاتی ہے ۔ اس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں ۔ لیکن واقعہ صحیح نہیں ، حدیث میں بھی اس کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں ۔ اس لئے ضرور ہے کہ صرف رواۃ کی بنا پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے ۔ بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اصولِ درایت کے مطابق ہیں یا نہیں ۔

درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضا و زمانہ کی خصوصیتوں ، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے ، اگر اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کی صحت بھی مشتبہ ہو گی ، یعنی یہ احتمال ہو گا ۔ کہ روایت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے ۔ اس قسم کے قواعد حدیث کی تحقیق و تنقید میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور انہی

کا نام اصول روایت ہے، علامہ ابن جوزی جو فن حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے، لکھتے ہیں کہ[1]

جس حدیث کو تم دیکھو کہ عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے، اس میں تحقیق حال کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے۔ جو حس و مشاہدہ سے باطل ثابت ہو۔ یا جس میں ایک معمولی سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا ذرا سے کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو، اس طرح کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کی روایتوں میں بہت پائی جاتی ہیں۔

امام ابو حنیفہ نے درایت کے جو اصول قائم کیے ان میں سے بعض ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو صحیح نہیں

۱۔ "جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں[2]" یہ وہی قاعدہ ہے، جس کو ابن جوزی نے تمام اصول درایت پر مقدم رکھا ہے ابن جوزی چھٹی صدی میں تھے، اس وقت اسلامی علوم اوجِ کمال پر پہنچ گئے تھے اور فلسفیانہ خیالات کا اثر زیادہ عام ہو گیا تھا، لیکن امام ابو حنیفہ کے زمانہ تک مذہب

---

[1] ابن جوزی کے الفاظ جیسا کہ فتح المغیث میں منقول ہے یہ ہیں۔

کل حدیث رایته یخالفه العقول او یناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلا یتکلف اعتباره ای لا تعتبر رویته ولا تنظر فی جرحهم او یکون مما یدفعه الحس والمشاهدة او مباینا لنص الکتاب او السنة المتواترة والاجماع القطعی حیث لا یقبل شئی من ذالک التاویل او تتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وهذا الاخیر کثیر موجود فی احادیث القصاص والطرقیة۔

[2] اس اصول کو علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

میں عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا، امام صاحب نے اول اول جب یہ قاعدہ قرار دیا اور روایات میں برتا تو سخت مخالفت ہوئی۔ اس قسم کی حدیثیں جن میں ناممکن اور محال واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ امام صاحب کے سامنے پیش کی جاتی تھیں، تو وہ ان سے انکار کرتے تھے، یہ امر عام لوگوں پر گراں گزرتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں روایات کی تحقیق وتنقید کا مدار صرف روات کی حالت پر تھا، اصول درایت سے غرض نہ تھی، زمانہ مابعد میں اگرچہ یہ قاعدہ اصول حدیث میں داخل کر لیا گیا، لیکن ارباب نے اس کو بہت کم برتا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بیسیوں مزخرف اور دور از کار حدیثیں قبولِ عام کے شرف سے ممتاز ہیں۔

تلک الغرانیق العلی کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی زبان سے (سورہ نجم کی تلاوت کے وقت) بتوں کی تعریف میں یہ الفاظ ادا ہوئے "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھم لترتجیٰ"۔ یعنی یہ بت بہت معزز ہیں۔ اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے" اور یہ الفاظ شیطان نے آنحضرت صلعم کی زبان میں ڈال دیئے تھے"، چنانچہ تلاوت کے بعد جبرئیل آئے اور انھوں نے یہ شکایت کی کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو نہیں سکھلائے تھے، آپ نے کہاں سے پڑھ دیئے۔ اس حدیث کو امام صاحب کے اصول کے موافق بعض محدثین مثلاً قاضی عیاض وابوبکر بیہقی وغیرہ نے غلط کہا، لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ اس کو اب بھی صحیح تسلیم کرتا ہے۔ متاخرین میں حافظ ابن حجر سے زیادہ نامور کوئی محدث نہیں گذرا، وہ بڑے زور شور سے اس حدیث کی تائید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کہ چونکہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں اس لیے اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح رد الشمس کی حدیث کو جس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضرت علیؓ کی نماز عصر قضا ہوگئی تھی، اس لئے آنحضرت (صلعم) کی دعا سے آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طالع ہوا، محدث ابن جوزی نے جرات کرکے موضوع کہا، لیکن حافظ

ابن حجر و جلال الدین سیوطی وغیرہ نے نہایت شدت سے مخالفت کی، امام صاحب کے زمانہ میں اس سے زیادہ مخالفتیں ہوئیں، لیکن وہ ان باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ عقل سے امام صاحب کی مراد وہ وسیع معنی نہیں ہیں، جو آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے قرار دیئے ہیں، جس کی رو سے شریعت کے بہت سے اصلی مسائل برباد ہوئے جاتے ہیں۔

۲۔ جو واقعات تمام لوگوں کو رات دن پیش آیا کرتے ہیں ان کے متعلق رسول اللہؐ سے کوئی ایسی روایت منقول ہو جو اخبار احاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہو گی۔ یہ اصول اس بنا پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں کو اکثر پیش آیا کرتے تھے ان کے متعلق جو کچھ آنحضرت (صلعم) کا ارشاد تھا، اس کی ضرورت تمام لوگوں سے متعلق رہتی تھی، اس لئے صرف ایک آدھ شخص تک اس روایت کا محدود رہنا درایت کے خلاف ہے۔

امام صاحب حدیث کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں کرتے تھے

امام ابوحنیفہ کی تصریحات سے ثابت ہے کہ وہ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے۔ امام محمد اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص رمضان میں کچھ بھول کر کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور قضا نہیں لازم آتی، حدیث پر استدلال کر کے لکھتے ہیں کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کچھ چیز نہیں پھر امام ابوحنیفہ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ لولا ما جاء فی ھذا من الآثار لامرت بالقضاء یعنی اگر اس بارہ میں آثار موجود نہ ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا[1]

ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق امام ابوحنیفہ کی شرطیں نہایت سخت ہیں۔ جب تک وہ شرطیں پائی نہ جائیں وہ حدیث کو قابل استدلال نہیں سمجھتے لیکن ان شرطوں کے ساتھ حدیث ثابت ہوں تو ان کے نزدیک پھر قیاس کوئی چیز نہیں

قیاس کے ایک اور معنی

جس حد تک ہم تحقیق کر سکے امام ابو حنیفہ نے قیاس فقہی کو حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھا۔ لیکن ان کے زمانہ تک قیاس کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل تھا اور بے شبہ ان معنوں کے لحاظ سے امام صاحب نے قیاس کو حدیثوں میں دخل دیا ہے۔ مسائل اور احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے تھے، ایک کا خیال تھا کہ شرعی احکام کسی مصلحت اور اقتضائے عقلی پر مبنی نہیں ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حسن و قبح اشیاء عقلی نہیں ہے۔ دوسرے فریق کی رائے تھی کہ تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں، جن میں سے بعض کی مصلحتیں صاف نمایاں ہیں اور خود شارع کے کلام سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کی مصلحت ہم کو معلوم نہیں، لیکن فی الواقع وہ مصالح سے خالی نہیں۔

اس اختلاف رائے نے حدیثوں کی روایت پر مختلف اثر پیدا کئے، بعض لوگ جب کسی حدیث کو سنتے تھے، تو صرف یہ دیکھ لیتے تھے۔ کہ اس کے راوی ثقہ ہیں، یا نہیں اگر ان کے خیال کے موافق قابل حجت ہیں، تو پھر ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی تھی اور بے تکلف اس حدیث کو قبول کر لیتے تھے، دوسرا فریق جو حسن و قبح عقلی کا قائل تھا یہ بھی دیکھتا تھا، کہ جو مسئلہ یا عقیدہ حدیث سے مستنبط ہوتا ہے، وہ عقل و مصلحت کے موافق یا نہیں، اگر نہیں ہوتا تھا، تو وہ حدیث کی زیادہ تحقیق و تنقید کی طرح مائل ہوتے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ راوی فہم و درایت کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتے ہیں، روایت باللفظ ہے یا بالمعنی موقع حدیث کیا تھا کون لوگ مخاطب تھے، کیا حالت تھی، غرض اس قسم کے اسباب اور وجوہ پر غور کرتے تھے، ان باتوں سے اکثر اصل حقیقت کا پتہ لگ جاتا تھا۔

طرز تحقیق و تشریح

صحیح ابن ماجہ و ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ (صلعم) سے حدیث روایت کی توضوا ھما غیرت

النار یعنی "جس چیز کو آگ نے متغیر کر دیا ہو اس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اسی بنا پر بعض مجتہدین قائل ہیں کہ گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو عبداللہ بن عباسؓ موجود تھے، بولے کہ اتوضا من الحمیم یعنی اس بنا پر تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازم آتا ہے"۔ ابوہریرہؓ نے کہا اے برادر زادہ! جب رسول (صلعم) سے کوئی روایت سنو تو اس پر مثالیں نہ کہو"۔ لیکن عبداللہ بن عباس اپنی رائے پر قائم رہے، حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی اس حدیث ان المیت لیعذب ببکاء اهله پر جو اعتراض کیا تھا، اسی طرز تحقیق پر مبنی تھا۔ اصحابہ کے حالات میں اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں (جن کا استقصا اس موقع پر ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک تھا اور اسی کو لوگوں نے قیاس کے لفظ سے شہرت دی اس مسئلہ پر کہ احکام شریعت مصالح پر مبنی ہیں، اس موقع پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے، شاہ ولی اللہ صاحب کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس بحث کے لئے کافی ووافی ہے۔ یہاں صرف اس قدر کہنا ضروری ہے کہ علمائے اسلام میں جو لوگ عقل ونقل کے جامع تھے (مثلاً امام غزالی، عزالدین عبدالسلام، شاہ ولی اللہ وغیرہ ان لوگوں کا یہی مسلک تھا، امام ابوحنیفہ احادیث کی تنقید میں اس اصول کو ضروری طور پر ملحوظ رکھتے تھے، دو متعارض حدیثیں جو روایت کی حیثیت سے یکساں نسبت رکھتی تھیں ان میں وہ اس حدیث کو ترجیح دیتے تھے، جو اصول مذکور کے موافق ہو۔

امام صاحب نے بعض موقعوں پر محض اس اصول کی مخالفت کی وجہ سے بعض حدیثوں کے تسلیم کرنے میں تامل کیا، ان کی اصطلاح میں یہ ایک علت خفیہ ہے۔ محدثین نے اقسام حدیث میں ایک قسم معلل قرار دی ہے، جس کی یہ تعریف قرار دی ہے کہ "حدیث میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں، اور وہ قابل استدلال نہیں ہوتی"۔ اس قسم کی حدیثوں کی تمیز پر محدثین کو نہایت فخر ہے۔ اور وہ اس کو ایک قسم کا الہام سمجھتے ہیں،

علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد اور بہت بڑے مشہور محدث تھے ان کا قول ہے کہ ھی الھام ولو قلت للقیم بالعلل این لك ھذا الم تکن له حجة[1] یعنی یہ الہام ہے۔ اور اگر تم ماہر علل سے پوچھو کہ تم نے کیونکر اس کو معلل کہا تو وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا"

محدث ابو حاتم سے ایک شخص نے چند حدیثیں پوچھیں، انہوں نے بعض کو مدرج، بعض کو باطل، بعض کو منکر، بعض کو صحیح بتایا، پوچھنے والے نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کیا آپ کو راوی نے ان باتوں کی اطلاع دی، ابو حاتم نے کہا نہیں، بلکہ مجھ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے کہا تو کیا آپ علم غیب کے مدعی ہیں۔ ابو حاتم نے جواب دیا کہ تم اور ماہرین فن سے پوچھو، اگر وہ میرے ہمزبان ہوں تو سمجھنا کہ میں نے بیجا نہیں کہا۔ سائل نے ابو ذرعہ سے وہ حدیثیں جا کر دریافت کیں، انہوں نے ابو حاتم کی موافقت کی، تب سائل کو تسکین ہوئی۔

بعض محدثین کا قول ہے۔ اثر یھجم علی قلوبھم لا یمکنھم ردّہٗ وھیئة نفسانیة لا معدل لھم یعنی وہ ایک امر ہے۔ جو ائمہ حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے، اور وہ اس کو رد نہیں کر سکتے، اور نفسانی اثر ہے، جس سے گریز نہیں ہو سکتا" محدثین کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، بلا شبہ فن روایت کی ممارست سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے خود تمیز ہو جاتی ہے۔ کہ یہ قول رسول اللہ (صلعم) کا ہو سکتا ہے۔ یا نہیں اسی طرح شریعت کے احکام اور مسائل اور ان کے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقرا سے ایسا ذوق حاصل ہو سکتا ہے، جس سے یہ تمیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ (صلعم) نے یہ حکم دیا ہوگا یا نہیں، لیکن ان اسرار اور مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے۔ وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان دقیق وجوہ کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ نے بعض حدیثوں کو معلل قرار دیا تو ارباب ظاہر نے مخالفت کی اور بعضوں کو بدگمانی ہوئی کہ امام

صاحب حدیث کو عقل ورائے کی بنا پر رد کرتے ہیں۔ لیکن انصاف پسند انصاف کر سکتا ہے کہ جب روایات اور ظاہر الفاظ کے استقراء سے محدثین کو ایسا مذاق پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک حدیث کو جس میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں۔ رد کر سکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ جس شخص نے دقتِ نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ احکام شریعت کے اسرار و مصالح کا تتبع کیا ہو وہ ایسے وجدان اور ذوق سے محروم رہے۔ البتہ یہ نازک اور ذمہ داری کا کام ہے۔ جس کا صرف وہ شخص متکفل ہو سکتا ہے جو بہت ہی بڑا عالم، مجتہد، محدث، دقیقہ رس مؤید بتائید الٰہی ہو۔ لیکن ان شرطوں کا جامع امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے

مراتب احادیث کا تفاوت

نہایت مہتم بالشان اور دقیق چیز جو امام ابو حنیفہ نے اس فن میں اضافہ کی، وہ احادیث کے مراتب کا تفاوت ہے، احکام اور مسائل کا پہلا ماخذ قرآن ہے، جس میں کسی کو گفتگو نہیں ہو سکتی، قرآن کے بعد حدیث کا رتبہ ہے۔ حدیث اور قرآن میں اصل امر کے لحاظ سے تو چنداں فرق نہیں، وہ وحی متلو ہے اور یہ غیر متلو جو کچھ تفاوت اور اختلاف ہے وہ ثبوت کی حیثیت سے ہے اگر کوئی حدیث اسی تواتر اور قطعیت سے ثابت ہو جس طرح قرآن ثابت ہے تو اثبات احکام میں وہ قرآن کے ہم پلہ ہے۔ لیکن حدیثوں کے مراتب متفاوت ہیں اور احکام کے ثبوت میں انہی تفاوتوں کے لحاظ کی ضرورت ہے، محدثین نے حدیث کی جو تقسیمیں کی ہیں یعنی صحیح، حسن، ضعیف، مشہور، عزیز، غریب وغیرہ ان کے اختلافِ مراتب سے احکام پر چنداں اثر نہیں پڑتا، چنانچہ ان قسموں میں سے محدثین صرف ضعیف کا اعتبار نہیں کرتے باقی اقسام کو قریباً یکساں قابل حجت قرار دیتے ہیں۔ محدثین کو اس سے زیادہ تدقیق اور امتیاز مراتب کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ استنباطِ احکام اور تصریح مسائل ان کا فرض نہ تھا۔ لیکن امام ابو حنیفہ کو تدوین فقہ کی وجہ سے جس کے وہ بانی اول ہیں زیادہ تدقیق اور فرق مراتب کی ضرورت پڑی انہوں نے نوعیت کے ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین

قسمیں قرار دیں ۔

متواتر

۱۔ متواتر یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں اس کثرت سے ہوں جن کے تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہو سکتا، یعنی رسول اللہ (صلعم) سے بے شمار لوگوں نے روایت کی ہو، اسی طرح ان لوگوں سے لے کر اخیر زمانہ تک بے شمار رواۃ روایت کرتے آتے ہوں ۔

۲۔ مشہور یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں تو بہت نہ ہوں لیکن دوسرے طبقہ سے اخیر تک اسی کثرت سے ہوں جو متواتر کے لیے مشروط ہے ۔

۳۔ احاد جو متواتر اور مشہور نہ ہو ۔

اس تقسیم کا اثر ان کی رائے کے موافق احکام شرعیہ پر جو پڑتا ہے، وہ یہ ہے ۔ کہ متواتر سے فرضیت اور رکنیت ثابت ہو سکتی ہے ۔ مشہور کا درجہ چونکہ متواتر سے کم ہے اس لیے فرضیت کا اثبات تو نہیں ہو سکتا لیکن قرآن میں جو حکم مطلق ہو حدیث مشہور سے مقید ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح اس سے زیادت علی الکتاب ہو سکتی ہے ۔ احاد کا ثبوت چونکہ بالکل ظنی ہے اس لیے وہ قرآن کے احکام منصوصہ پر کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتی، یہ مسئلہ اگرچہ نہایت واضح اور صاف ہے لیکن تعجب ہے ۔ کہ امام شافعی اور بعض محدثین اس کے مخالف ہیں ۔ امام بیہقی وغیرہ نے بعض مناظرات نقل کئے ہیں، جو امام شافعیؒ اور امام محمدؒ میں واقع ہوئے اور جن میں یہ بیان کیا گیا ہے ۔ کہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کو بند کر دیا ۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مناظرے فرضی مناظرے ہیں ۔ جن کا ثبوت اصول روایت کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا لیکن اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے ۔ کہ اس مسئلہ کا انتساب امام ابو حنیفہ کی طرف ضرور صحیح ہے ۔

قوی سے قوی اعتراض جو اس مسئلہ پر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ خود امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ اس کے پابند نہ رہ سکے، شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا

کہ امام شافعی نے امام محمد سے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک خبرِ واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں ہو سکتی۔ امام محمد نے کہا ہاں، امام شافعی نے کہا کہ قرآن مجید میں وارثوں کے حق میں وصیت کا حکم ہے۔ آپ اس حدیث کی بنا پر لا وصیۃ للوارث وصیت کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہو۔

غالباً شاہ صاحب نے یہ روایت بیہقی رح کی مناقب الشافعی رح سے لی ہے، جس میں اور بھی بے سروپا روائتیں مذکور ہیں، لیکن ہم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں، کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وراثت کا حکم کسی حدیث سے نہیں منسوخ ہوا بلکہ خود قرآن مجید کی اس آیت سے جس میں توریت کے احکام ہیں، یہ صرف حنفیوں ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے۔ الا الشاذ النادر منھم۔

ان مسائل پر اور بھی بہت سی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں، جن کی تفصیل ہم نہیں کر سکتے لیکن اخبار احاد کی بحث اور اس سے عقائد اسلام پر جو اثر پڑتا ہے اس کو ہم اس موقع پر تفصیل سے لکھتے ہیں، کیونکہ بعض محدثین کو زیادہ تر اسی مسئلہ میں ان سے اختلاف ہے۔

اخبار احاد کی حیثیت

اخبار احاد کی نسبت اگرچہ محققین اور اکثر ائمہ حدیث کا بھی یہی مذہب ہے، کہ وہ ظنی الثبوت ہیں۔ لیکن ایک فرقہ اس کے خلاف بھی ہے جس کے سرگروہ علامہ ابن الصلاح ہیں، اگرچہ علامہ ابن الصلاح نے بھی اخبار احاد کی تمام حدیثوں کو قطعی نہیں تسلیم کیا ہے انہوں نے صحیح حدیث کی سات قسمیں کی ہیں (۱) جس پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہوں (۲) بخاری منفرد ہوں (۳) مسلم منفرد ہوں (۴) بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہ کیا ہو، لیکن ان کی شرطوں کے موافق ہو۔ (۵) صرف بخاری کی شرط پر ہو (۶) صرف مسلم کی شرط پر ہو (۷) بخاری و مسلم کی شرط کے موافق نہ ہو، لیکن اور محدثین نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہو۔ ان سات قسموں

میں سے علامہ ابن الصلاح پہلی قسم کو قطعی الصحۃ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وھذا القسم جمیعہ مقطوع بصحتہ والعلم النظری واقع بہ مفردات بخاری و مسلم کی نسبت اُن کی رائے ہے کہ اسی قبیل میں بجز ان چند حدیثوں کے جن پر دار قطنی وغیرہ نے جرح کی ہے، ابن الصلاح کا قول اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آج کل زیادہ رواج پا گیا ہے، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے۔ اور خود ائمہ حدیث اس کے مخالف ہیں علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں ابن الصلاح کا قول تفصیلاً نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وھذا الذی ذکرہ الشیخ فی ھٰذہ المواضع خلاف ما قالہ المحققون والاکثرون فانھم قالوا احادیث الصحیحین التی لیست لمتواترۃ انما تفید الظن فانھا احاد والاحاد انما تفید الظن علیٰ ما تقرر ولا فرق بین البخاری ومسلم وغیرھما فی ذالک۔

یعنی "شیخ ابن الصلاح نے ان موقعوں پر جو کچھ کہا وہ محققین اور اکثروں کی رائے کے خلاف ہے، کیونکہ محققین اور اکثروں کا قول ہے کہ صحیحین کی حدیثیں جو تواتر کے رتبہ کو نہیں پہنچی ہیں، صرف ظن کی مفید ہیں، کیونکہ وہ اخبار احاد ہیں اور اخبار احاد کی نسبت ثابت ہو چکا ہے۔ کہ ان سے صرف ظن پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس بات میں بخاری و مسلم اور اور لوگ سب برابر ہیں"۔ ابن الصلاح کے قول کو اور ائمہ فن نے بھی رد کیا ہے لیکن ہم اس بحث کو لفظی طور سے طے کرنا نہیں چاہتے، ہم کو خود غور کرنا چاہیے کہ اخبار احاد سے یقین پیدا ہو سکتا ہے یا ظن۔

احادیث کے ظنی الثبوت ہونے کی تحقیق

کسی حدیث کو جب ایک محدث گو وہ کسی رتبہ کا ہو صحیح کہتا ہے۔ تو اس کا یہ دعویٰ درحقیقت چند ضمنی دعووں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ روایت متصل ہے اس کے رواۃ ثقہ ہیں ضابطہ القلب ہیں، روایت میں شذوذ نہیں ہے کوئی علت قادحہ

نہیں ہے، یہ سب امور ظنی اور اجتہادی ہیں جن پر یقین کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے، جس طرح ایک فقیہ کسی مسئلہ کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے۔ اور اس قسم کی صحت یقینی نہیں ہوتی، کیونکہ استنباط میں جن مقدمات سے اُس نے کام لیا ہے، اکثر اس کے ظنیات ہیں۔ اسی طرح حدیث کا حال ہے، کسی حدیث کو صحیح کہنا محدث کے ظنیات و اجتہادات پر مبنی ہے۔ ایک یا چند محدثین نے کسی حدیث کو اگر صحیح کہا ہے، اور دوسرا شخص اس کی صحت نہیں تسلیم کرتا، تو وہ صرف اس گناہ کا مجرم ہے کہ اس محدث یا محدثین کے اصول تحقیق، قواعد استنباط، طریق روایت غرض ان کے اجتہادات اور مزعومات کا مخالف ہے۔

حدیث کی تحقیق و تنقید کے لئے محدثین نے جو اصول مقرر کئے ہیں، اور جن پر احادیث کی صحت کا مدار ہے، سب عقلی اور اجتہادی مسائل ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں خود محدثین باہم اختلافِ عظیم رکھتے ہیں۔ بظاہر بینوں کا خیال ہے کہ حدیث کا فن نقلی ہے (نہ عقلی) لیکن جس شخص نے اصولِ حدیث پر غور کیا ہے وہ اس خیال کی غلطی کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس نکتہ کی طرف امام ابوحنیفہ نے اشارہ کیا ہے کہ ھذا الذی نحن فیہ رائ لا ابخیر علیہ احد اولا نقول یجب علی احد قبولہ۔ بعضوں نے غلطی سے امام صاحب کے اس وسیع قول کو فقہ پر محدود سمجھا، لیکن ان کو معلوم نہیں کہ مجتہد کو مسائل کے ماخذ سے بحث ہوتی ہے۔

صحت اور عدم صحت پر اختلاف

اصولِ حدیث کے ظنی اور اجتہادی ہونے کا ہی اثر ہے کہ محدثین کو احادیث کی صحت و عدم صحت میں باہم اختلاف ہوتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح، مستند، واجب العمل قرار دیتا ہے، دوسرا اسی کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے۔ محدث ابن جوزی نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے، جن کو دوسرے محدثین

صحیح اور احسن کہتے ہیں۔ ابن جوزی نے تو یہ قیامت کی کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھ دیا، علامہ سخاوی لکھتے ہیں، بل ربما اورج فیھا الحسن و الصحیح مما ھو فی احد الصحیحین فضلا عن غیرھما یعنی "ابن جوزی نے حسن اور صحیح تک کو جو بخاری یا مسلم میں موجود ہیں موضوعات میں درج کر دیا ہے۔ دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے" بے شبہ ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی، لیکن یہ غلطی ایک اجتہادی غلطی ہے، جس کا حاصل اسی قدر ہے۔ کہ انہوں نے بخاری یا مسلم کے صحیح اجتہاد کو غلط تقسیم کیا ان اصولی اختلافات کی وجہ سے احادیث کی صحت اور عدم صحت میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حدیث مرفوع کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ رسول اللہ (صلعم) تک ثابت ہو لیکن اتصال کے ثبوت کے جو طریقے تسلیم کیے گئے ہیں، ان میں اکثر ظنی اور اجتہادی ہیں۔ صحابہ کے ان الفاظ کو "یہ امر سنت ہے، ہم کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ ہم اس بات سے روکے گئے تھے، رسول اللہ (صلعم) کے زمانہ میں ہم فلاں کام کرتے تھے، یا ہم اس کو برا نہیں سمجھتے تھے"۔ اکثروں نے مرفوع قرار دیا ہے، اور بعضوں نے یہاں تک وسعت دی کہ جن حدیثوں میں یہ الفاظ تھے ان کو لفظوں سے روایت کر دیا کہ رسول اللہ (صلعم) نے یہ فرمایا"۔ حالانکہ یہ الفاظ اس معنی میں قطعی الدلالہ نہیں ہیں۔ بلکہ صحابہ کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ جس کی نسبت عموماً تسلیم کیا گیا ہے۔ فھم الصحابی لیس بحجۃ یعنی صحابی کی سمجھ کوئی دلیل نہیں"۔ اس بنا پر بعض علما نے اختلاف کیا اور کہا یہ الفاظ اتصال و رفع کے لیے کافی نہیں ہیں۔ امام شافعی ابن حزم ظاہری ابو بکر رازی اور دیگر محققین نے صحابہ کے اس قول کو کہ "یہ فعل سنت ہے" حدیث مرفوع نہیں قرار دیا، کتب سیر و احادیث میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ جن میں صحابی نے یہ الفاظ استعمال کیے، وہ حدیث نبوی نہ تھی بلکہ خود ان کا قیاس و اجتہاد تھا، لیکن

اکثر محدثین نے ان حدیثوں کو مرفوع کہا اس خیال نے یہ آفت پیدا کی کہ اس کی بناد پر بعض رواۃ نے صریح مرفوع الفاظ میں حدیث کی روایت کر دی، جس کی وجہ سے ایک عام شبہ پیدا ہو گیا۔

معنعن حدیثوں کے بارے میں

معنعن روائیتوں میں اتصال کا ثابت ہونا نہایت مشکل ہے، حالانکہ اس قسم کی روایتیں کثرت سے ہیں، امام بخاری کا مذہب ہے کہ معنعن حدیثوں میں اگر یہ ثابت ہو کہ راوی اور مروی عنہ دونوں ہم زماں اور کبھی ملے بھی تھے، تو وہ حدیث متصل سمجھی جائے گی، امام مسلم حالانکہ امام بخاری کے شاگرد اور زیادہ تر انہی کے طریقے کے پیرو تھے، تاہم انہوں نے نہایت سختی سے اس شرط کی مخالفت کی ہم زماں ہونا کافی سمجھا، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ بخاری کے اصول کے موافق امام مسلم کی وہ تمام معنعن روایتیں جن میں لقا ثابت نہیں ہے مقطوع ہیں، حالانکہ امام مسلم ان کو متصل سمجھتے ہیں اور اس پر ان کو یہاں تک اصرار ہے کہ اپنے مخالف کو سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں، امام مسلم نے تو زیادہ توسیع کی، لیکن امام بخاری کی شرط کے موافق بھی معنعن روایت میں اتصال کا ثبوت محض ظنی ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ دو شخص ہم زمان اور ہم لقا ہوں تو اُن کی روائتیں ہمیشہ بالذات ہوں، جہاں حدثنا اور اخبرنا ہوگا وہاں ایسا ہونا البتہ ضرور ہے، لیکن اگر یہ الفاظ نہیں ہیں اور راوی نے "عن" کے لفظ سے روایت کی ہے تو اتصال کا خیال قیاس غالب ہوگا۔ لیکن یقینی نہ ہوگا، حدیث و سیر میں بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ دو راوی ایک زمانہ میں تھے اور آپس میں ملاقات بھی تھی، تاہم ایک نے دوسرے سے بعض روائتیں بواسطہ کیں، روزمرہ کے تجربوں میں اس کی سینکڑوں شہادتیں ملتی ہیں۔

رجال کی تنقید

سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے، اخبار احاد کا تمام تر مدار رجال پر ہے، لیکن رجال کی تنقید و توثیق ایسا

ظنی مسئلہ ہے جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے، ایک شخص کو بہت سے لوگ نہایت ثقہ، نہایت متدین، نہایت راست باز سمجھتے ہیں۔ اسی شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایۃ غیر ثقہ، ناقابلِ اعتبار خیال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس رتبہ کے ہوتے ہیں، جن کی عظمت و شان سے انکار نہیں کیا جا سکتا، امام بخاری و مسلم میں گو ایسا سخت اختلاف نہیں ہے، تاہم بہت سے رواۃ ہیں۔ جن کو ان دونوں اماموں میں سے ایک قابل حجت سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا، علامہ نووی نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے۔ اور امام بخاری نے جامع صحیح میں ان سے حجت نہیں لی، ۶۲۵ ہے۔

راویوں کی جرح و تعدیل میں اختلاف

میزان الاعتدال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں رواۃ ہیں جن کی جرح و تعدیل مختلف فیہ ہے اور ایسا ہونا ضرور تھا، کسی شخص کے ان اوصاف و عادات پر مطلع ہونا جن کا اثر روایت کی قوت و ضعف پر پڑ سکتا ہے، مدتوں کی ملاقات اور تجربہ پر موقوف ہے، جو لوگ جرح و تعدیل کے کام میں مصروف تھے، سینکڑوں ہزاروں راویوں سے ایسی عمیق واقفیت کیونکر حاصل کر سکتے تھے، اسی مختلف قرائن، ظاہری آثار، عام شہرت، سمعی روایتوں سے کام لینا پڑتا ہے، اور بہت کم قطعی فیصلہ ہو سکتا تھا، اگرچہ محدثین نے معارضات کے رفع کرنے کے لئے اصول قرار دیئے ہیں، لیکن وہ اصول خود اجتہادی اور مختلف فیہ ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر محدثین کو خود اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جرح کو عموماً تعدیل پر مقدم مانا گیا ہے۔ لیکن بہت سے رواۃ ہیں جن کی نسبت اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ محمد بن بشار مصری احمد بن صالح مصری، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ کی نسبت مفصل جرحیں موجود

ہیں تاہم ان جرحوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

تعجب یہ ہے کہ جارحین و معدلین دونوں ائمہ فن ہوتے ہیں اور ان کی رایوں میں اس قدر اختلاف ہوتا ہے، جس سے سخت تعجب پیدا ہوتا ہے، جابر جعفی کوفی ایک مشہور راوی ہے، جس کا دعوے تھا کہ مجھ کو پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ ان کی نسبت ائمہ جرح و تعدیل کی یہ رائیں ہیں۔

سفیان کا قول ہے کہ میں نے جابر سے زیادہ محتاط حدیث میں نہیں دیکھا شعبہ کہتے ہیں کہ جابر جب اخبرنا و حدثنا کہیں تو وہ اوثق الناس ہیں۔ امام سفیان ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر جعفی میں گفتگو کرو گے تو میں تم سے گفتگو نہ کروں گا۔ وکیع کا قول ہے کہ تم لوگ اور کسی بات میں شک کرو تو کرو، لیکن اس بات میں کچھ شک نہ کرو۔ کہ جابر جعفی ثقہ ہیں اس کے مقابلہ میں اور ائمہ فن کی رائیں ہیں۔ جن کے یہ الفاظ ہیں کہ وہ متروک ہیں، کذاب ہے، وضاع ہے، چنانچہ اخیر فیصلہ جو محدثوں نے کیا وہ یہی ہے۔ کہ جابر کی روایت قابل اعتنا نہیں۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ جرح و تعدیل کا فن ناقابل اعتبار ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ جن وسائل اور طرق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جا سکتے تھے۔ ان کا مرتبہ ظن غالب یا محض ظن سے فائق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس پر یقینیات اور قطعیات کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔

ادائے مطلب

ان امور کے بعد تادیہ معنی کی بحث باقی رہتی ہے مثلاً ایک حدیث تمام محدثین اور مجتہدین کے اصول کے موافق متصل بھی ہے، رواۃ بھی ثقہ ہیں شذوذ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ بحث اب بھی باقی ہے۔ کہ راوی نے ادائے مطلب کیونکر کیا؟ موقع اور محل روایت کی تمام خصوصیتیں ملحوظ رکھیں یا نہیں؟ فہم مطلب یا طریقہ ادا میں تو کوئی غلطی نہیں کی؟ چونکہ یہ مسلم ہے۔ کہ حدیثیں اکثر بالمعنی روایات کی

گئی ہیں۔ اس لیے ان احتمالات کو زیادہ قوت ہو جاتی ہے، صحابہ کے زمانہ میں کسی روایت کی صحت سے انکار کیا جاتا تھا، تو اسی بنا پر کیا جاتا تھا۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ صحابہ عموماً ثقہ تھے اور ان کی روایت میں انقطاع کا کوئی احتمال نہ تھا، صحیح مسلم باب التیمم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا کہ مجھ کو غسل کی حاجت ہوئی اور پانی نہ مل سکا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نماز نہ پڑھو، عمارؓ موجود تھے، انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ (صلعم) سے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ اس موقع پر آپ بھی موجود تھے حضرت عمرؓ نے کہا اتق اللہ یا عمار یعنی "اے عمار خدا سے ڈرو" ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ عمار کو کاذب الروایۃ نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس احتمال پر کہ شاید ادائے مطلب میں غلطی ہوئی یہ الفاظ فرمائے چنانچہ عمارؓ نے کہا کہ "اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں یہ حدیث نہ روایت کروں" اخبار احاد کی بحث کو ہم نے قصداً اس لئے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہ پر ردوقدح کرتے ہیں، حالانکہ امام صاحب کا مذہب نہایت تحقیق اور دقتِ نظر پر مبنی ہے۔

یہ تمام احتمالات اور اجتہادات اخبار احاد کے ساتھ مخصوص ہیں، متواتر اور مشہور میں ان بحثوں میں مساغ نہیں، انہی وجوہ اور اسباب سے اخبار احاد کے متعلق مختلف رائیں پیدا ہو گئیں معتزلہ نے تو سرے سے انکار کیا۔ ان کے مقابلہ میں بعض محدثین نے یہ شدت کی کہ خبر واحد کو قطعی قرار دیا، صرف شرط یہ لگائی کہ رواۃ ثقہ ہوں، اور انقطاع و شذوذ و علت نہ ہو بعض محدثین اگرچہ اصول کے طور پر اخبار احاد کو ظنی کہتے ہیں، لیکن جزئیاتِ احکام اور مسائل اعتقادی میں اس کا خیال نہیں رکھتے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس بحث میں جو مسلک اختیار کیا۔ وہ نہایت معتدل اور ان کی دقتِ نظر کی بڑی دلیل ہے۔ انہوں نے نہ معتزلہ کی طرح سرے سے انکار کیا نہ ظاہر بینوں کی طرح خوش اعتقادی سے اس کی قطعیت تسلیم کی امام صاحب کی یہ رائے بڑے صحابہ کی رائے کے موافق ہے۔

خبر واحد قطعی نہیں

حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ نے متعدد مواقع پر خبر واحد کی تسلیم میں تردد کیا ہے جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اخبار احاد کو قطعی نہیں سمجھتے تھے۔ فاطمہ بنت قیس نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے رسول اللہؐ سے روایت کی کہ لا سکنی ولا نفقۃ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

لا نترک کتاب اللہ بقول امرأۃ لا ندری صدقت امکذبت

یعنی ایک عورت کی روایت کی بنا پر جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اس نے غلط کہا یا صحیح ہم کتاب الٰہی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ فقہی احکام میں اس قاعدہ کی متعدد تفریعیں ہیں مثلاً یہ کہ اخبار احاد سے کسی حکم کا فرض ہونا ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ فرضیت ثبوت قطعی کی محتاج ہے۔ البتہ اس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے وجوب، تسنن و استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر نماز میں قرأت فاتحہ کو امام شافعیؒ فرض سمجھتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ واجب اس اصول پر بہت سے احکام متفرع ہیں۔

اس قاعدہ کا اثر علم کلام کے مسائل پر

فقہ سے زیادہ اس قاعدہ کا اثر علم کلام پر پڑتا ہے۔ اور یہی چیز ہے۔ جس نے ایک زمانہ کو امام ابوحنیفہؒ کا مخالف بنا دیا تھا۔ امام صاحبؒ نے مذکورہ بالا قاعدہ کی بنا پر یہ اصول قرار دیا تھا۔ کہ جو مسائل اور عقائد اسلام میں متفق علیہ ہیں۔ ان کے خلاف اخبار احاد قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً انبیاء کی عصمت اہل حق کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے۔ اس کے برخلاف جن روایتوں سے انبیاء کا مرتکب کبائر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے اصول کے موافق وہ روائتیں قابل اعتبار نہیں۔ اس اصول کی بنا پر بہت سے اشکالات سے جو ملاحدہ پیش کرتے ہیں نجات ملتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اکثر ارباب روایت نے اس عمدہ اصول کی قدر نہ کی بلکہ الٹی اور مخالفت کی۔ علامہ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں کتاب الکنی میں لکھا ہے:

كان من مذهب الامام ابی حنیفةؒ فی اخبار احاد ان لا یقبل عنها المخالف لاصول المجمع علیها فانکر علیها اصحاب الحدیث فافرطوا[1]

یعنی اخبار احاد میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب تھا کہ اصول متفق علیہ کے خلاف ہو تو قابلِ قبول نہیں۔ اس پر اصحاب حدیث نے ان کی مخالفت کی اور افراط کو پہنچا دیا۔”

---

[1] اس عبارت کو حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں نقل کیا۔

فقہ اور اس کے خصوصیات وممیزات

اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، مغازی ان کی ابتدا اگرچہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہوئی لیکن جس وقت تک ان کو فن کی حیثیت نہیں حاصل ہوئی، وہ کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں ہوئے۔ دوسری صدی کے اوائل میں تدوین وترتیب شروع ہوئی اور جن لوگوں نے تدوین وترتیب کی وہ ان علوم کے بانی کہلائے۔ چنانچہ بانیٔ فقہ کا لقب امام ابوحنیفہ کو ملا۔ جو درحقیقت اس لقب کے سزاوار تھے۔ اگر ارسطو علم منطق کا موجد ہے تو بے شبہ امام ابوحنیفہ رح بھی علم فقہ کے موجد ہیں۔ امام صاحب کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہی ہے۔ اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اصل مقصد سے پہلے ضرور ہے کہ مختصر طور پر ہم علم فقہ کی تاریخ لکھیں۔ جس سے ظاہر ہو کہ یہ علم کب شروع ہوا۔ اور خاص کر یہ کہ امام ابوحنیفہ رح نے جب اس کو پایا تو اس کی کیا حالت تھی۔

فقہ کی مختصر تاریخ

فقہ کی تاریخ پر شاہ ولی اللہ صاحب رح نے ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے۔ جس کا التقاط ہمارے لیے کافی ہے وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ (صلعم) کے زمانہ میں احکام کی قسمیں نہیں پیدا ہوئی تھیں آنحضرت (صلعم) صحابہ کے سامنے وضو فرماتے تھے۔ اور کچھ نہ بتاتے تھے۔ کہ یہ رکن ہے۔ یہ واجب ہے، یہ مستحب ہے۔ صحابہ آپ کو دیکھ کر اسی طرح وضو کرتے تھے۔ نماز کا بھی یہی حال تھا۔ یعنی صحابہ فرض وواجب وغیرہ کی تفصیل وتدقیق نہیں کرتے تھے جس طرح رسول اللہ (صلعم) کو نماز پڑھتے دیکھا خود بھی پڑھ لی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی قوم کو رسول اللہ (صلعم) کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا۔ لیکن انہوں

نے رسول اللہ (صلعم) کی زندگی میں تیرہ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے۔ جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں"۔ البتہ جو واقعات غیر معمولی طور سے پیش آتے تھے۔ ان میں لوگ آنحضرت (صلعم) سے استفتاء کرتے اور آنحضرت (صلعم) جواب دیتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگوں نے کوئی کام کیا۔ اور آپ نے اس پر تحسین کی یا اس سے نارضامندی ظاہر کی۔ اس قسم کے فتوے اکثر عام مجمعوں میں ہوتے تھے اور لوگ آنحضرت (صلعم) کے اقوال کو ملحوظ رکھتے تھے۔

آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد فتوحات کو نہایت وسعت ہوئی اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ واقعات اس کثرت سے پیش آئے کہ اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً کسی شخص نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا۔ اب بحث یہ پیش آئی کہ "نماز ہوئی یا نہیں"۔ اس بحث کے پیدا ہونے کے ساتھ یہ تو ممکن نہ تھا کہ نماز میں جس قدر اعمال تھے۔ سب کو فرض کہہ دیا جاتا۔ صحابہ کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز میں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں۔ کتنے مسنون اور مستحب۔ اس تفریق کے لئے جو اصول قرار دیئے جا سکتے تھے۔ ان پر تمام صحابہ کی رایوں کا متفق ہونا ممکن نہ تھا۔ اس لیے مسائل میں اختلاف آرا ہوا۔ اور اکثر مسئلوں میں صحابہ کی مختلف رائیں قائم ہوئیں۔ بہت سے ایسے واقعات پیش آئے کہ رسول اللہ (صلعم) کے زمانہ میں ان کا عین و اثر بھی پایا نہیں گیا تھا۔ صحابہ کو ان صورتوں میں استنباط، تفریع حمل، نظیر، قیاس سے کام لینا پڑا۔ ان اصول کے طریقے یکساں نہ تھے۔ اس لیے ضروری اختلاف پیدا ہوئے۔ غرض صحابہ ہی کے زمانہ میں احکام اور مسائل کا ایک دفتر بن گیا اور جدا جدا طریقے قائم ہوئے۔

صحابہ میں جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہہ کہلائے، ان میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ و عبداللہ بن مسعودؓ زیادہ تر کوفہ میں رہے۔ اور وہیں ان کے مسائل و احکام کی زیادہ ترویج ہوئی۔ اس تعلق سے کوفہ فقہ کا دارالعلوم بن گیا جس طرح کہ حضرت عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا تھا۔

حضرت علیؓ بچپن سے رسول اللہ (صلعم) کی آغوش تربیت میں پلے تھے۔ اور جس قدر ان کو آں حضرت (صلعم) کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا کسی کو نہیں ملا تھا، ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ اور صحابہ کی نسبت کثیر الروایۃ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ میں آنحضرت (صلعم) سے کچھ دریافت کرتا تھا۔ تو بتاتے تھے۔ اور چپ رہتا تھا تو خود ابتدا کرتے تھے"۔ اس کے ساتھ ذہانت، قوت استنباط ملکۂ استخراج ایسا بڑھا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ اعتراف کرتے تھے، حضرت عمرؓ کا عام قول تھا کہ خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علیؓ موجود نہ ہوں"۔ عبداللہ بن عباس خود مجتہد تھے، مگر کہا کرتے تھے کہ جب ہم کو علیؓ کا فتویٰ مل جائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ بن مسعود

عبداللہ بن مسعودؓ بھی حدیث و فقہ دونوں میں کامل تھے رسول اللہ (صلعم) کے ساتھ جس قدر جلوت اور خلوت میں ہمدم و ہمراز رہے تھے، بہت کم لوگ رہے ہوں گے۔ صحیح مسلم میں ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ ہم یمن سے آئے اور کچھ دنوں تک (مدینہ) میں رہے۔ ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ کو رسول اللہ (صلعم) کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم ان کو رسول اللہ (صلعم) کے اہل بیت سے گمان کرتے رہے"۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو دعویٰ تھا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں۔ کہ کس باب میں اتری ہے"۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کا مجھ سے زیادہ

عالم ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاتا"۔ صحیح مسلم میں ہے۔ کہ انہوں نے ایک مجمع میں دعوٰی کیا کہ تمام صحابہ جانتے ہیں۔ کہ میں قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہوں، شفیق اس جلسہ میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اس واقعہ کے بعد میں اکثر صحابہ کے حلقوں میں شریک ہوا، مگر کسی کو عبداللہ بن مسعودؓ کے دعوٰی کا منکر نہیں پایا۔

عبداللہ بن مسعودؓ باقاعدہ طور پر حدیث و فقہ کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی درسگاہ میں بہت سے تلامذہ کا مجمع رہتا تھا۔ جن میں سے چند شخص یعنی اسود، عبیدہ، حارث، علقمہ نہایت نامآور ہوئے۔ علقمہ رسول اللہ (صلعم) کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عائشہؓ، سعدؓ، حذیفہؓ، خالد بن الولیدؓ، خبابؓ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں، خاص کر عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت میں اس التزام سے رہے اور ان کے طور و طریقہ کے اس قدر قدم بقدم چلتے تھے کہ لوگوں کا قول تھا۔ کہ جس نے علقمہ کو دیکھ لیا اس نے عبداللہ بن مسعودؓ کو دیکھ لیا"۔ خود عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تھا۔ کہ جس قدر علقمہ کی معلومات ہیں۔ میری معلومات اس سے زیادہ نہیں ہیں"۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ صحابہ ان سے مسائل دریافت کرنے آتے تھے عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں اگر کوئی شخص علقمہ کا ہمسر تھا تو اسود تھے۔

ابراہیم نخعی

علقمہ و اسود کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعی مسند نشین ہوئے اور فقہ کو بہت کچھ وسعت دی، یہاں تک کہ ان کو فقیہ العراق کا لقب ملا علم حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ صیرفی الحدیث" کہلاتے تھے، امام شعبی نے جو علامۃ التابعین کے لقب سے ممتاز ہیں، ان کی وفات کے وقت کہا "ابراہیم نے کسی کو نہیں چھوڑا، جو ان سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو"۔ اس پر ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کیا حسن بصری اور ابن سیرین بھی شعبی نے کہا حسن بصری اور ابن سیرین پر کیا ختم ہے۔ بصرہ، کوفہ، شام، حجاز میں کوئی شخص ان سے زیادہ عالم نہیں رہا۔

ابراہیم نخعی کے عہد میں مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ تیار ہو گیا تھا، جس کا ماخذ

حدیثِ نبوی اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ تھے۔ یہ مجموعہ گو مرتب طور پر قلمبند نہیں کیا گیا، لیکن ان کے شاگردوں کو اس کے مسائل زبانی یاد تھے، سب سے زیادہ یہ مجموعہ حماد کے پاس جمع تھا جو ابراہیم کے تلامذہ میں نہایت ممتاز تھے، چنانچہ ان کے مرنے کے بعد فقہ کی مسندِ خلافت بھی انہی کو ملی، حماد نے گو فقہ کو چنداں ترقی نہیں دی لیکن ابراہیم کے مجموعہ فقہ کے بہت بڑے حافظ تھے۔ حماد نے سنہ ۱۲۰ھ میں قضا کی اور لوگوں نے ان کی جگہ امام ابوحنیفہؒ کو فقہ کی مسند پر بٹھایا۔

امام صاحب کے زمانہ تک اگرچہ فقہ کے معتد بہ مسائل مدون ہو چکے تھے لیکن اولاً تو یہ تدوین صرف زبانی روایت تھی، دوسرے جو کچھ تھا فن کی حیثیت سے نہ تھا، نہ استنباط واستدلال کے قواعد قرار پائے تھے نہ احکام کی تفریع کے اصول منضبط تھے۔ نہ حدیثوں میں امتیازِ مراتب تھا، نہ قیاس اور تشبیہ النظیر کے قاعدے مقرر تھے، مختصر یہ کہ فقہ جزئیات کے مسائل کا نام اور اس کو قانون کے رتبہ تک پہنچانے کے لئے بہت سے زینے باقی تھے۔

امام ابوحنیفہ کو فقہ کی تدوین کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟

تاریخ سے اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ امام ابوحنیفہ کو خاص کس وجہ سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا، قلائد عقود العقیان کے مصنف نے المنوذج القتال سے اس کا ایک قصہ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس کچھ امانت رکھتے گئے، ایک ان میں سے نہا کر نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی، اُس نے دے دی، یہ لے کر چلتا ہوا دوسرا حمام سے باہر آیا اور امانت مانگی تو اس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کو حوالہ کردی، اس نے عدالت میں استغاثہ کیا۔ قاضی صاحب نے حمامی کو ملزم ٹھہرایا کہ جب دونوں نے مل کر تیرے پاس امانت رکھی تھی تو تجھ کو ضرور تھا کہ دونوں کی موجودگی میں واپس

کرتا، حمامی گھبرایا ہوا امام صاحب ابوحنیفہ کے پاس آیا۔ امام صاحب نے کہا کہ تم اس شخص سے کہو میں تمہاری امانت ادا کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن قاعدے کے موافق تنہا تم کو نہیں دے سکتا، شریک کو لاؤ تو لے جاؤ۔ اس واقعہ کے بعد امام صاحب کو فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا اور اس کی ترتیب شروع کی۔

ممکن ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو لیکن اس خیال کے پیدا ہونے کے اصلی اسباب دوسرے تھے، یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال قریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا یعنی جب اُن کے اُستاد حماد نے وفات پائی یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام میں تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا، عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے، اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتّب مجموعۂ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا، نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلّم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی، ایسے وقت پر قدرتی طور پر لوگوں کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔

امام ابوحنیفہ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی طور پر مقننانہ واقع ہوئی تھی، اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے ان کو معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا۔ اطراف و بلاد سے ہر روز جو سینکڑوں ضروری استفتاء آتے تھے، ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے، قضاۃ اور حکام، فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے جنہوں نے ان کو اس فن کی تدوین اور ترتیب پر آمادہ کیا، ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اس آمادگی کو اور تحریک ہوئی ہو جس کے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا۔

تلامذہ جو فقہ کی تدوین میں شریک تھے

امام صاحب نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا، وہ نہایت وسیع اور پر خطر کام تھا، اس لئے انہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا، اس غرض سے انہوں تے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص منتخب کئے۔ جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لئے ضروری تھے، اُستادِ زمانہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حبان، مندل، حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر قوتِ استنباط میں مشہور تھے، قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال تھا، امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی، امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابو حنیفہ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی، چالیس تھے۔ جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے، ابو یوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد التمیمی یحییٰ بن ابی زائدہ، امام طحاری نے یہ بھی روایت لکھی ہے کہ :

لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی اور وہ تیس برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں کم و بیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا یعنی سنہ ۱۲۱ھ سے سنہ ۱۵۰ھ تک جو امام ابو حنیفہ کی وفات کا سال ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحییٰ سنہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس لئے وہ شروع سے کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔ طحاوی نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں۔ ان کے سوا عافیہ ازدی، ابو علی، عزی، علی مسہر، قاسم بن معن، حبان مندل بھی اس مجلس کے ممبر رہے تھے۔

طریقۂ تدوین

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔

اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلمبند کر لیا جاتا اور نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں، کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی، امام صاحب بہت غور اور تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سُنتے اور بالآخر ایسا جچا تُلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلہ کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی رایوں پر قائم رہتے، اُس وقت وہ سب مختلف اقوال قلمبند کر لئے جاتے، اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہولیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

عافیہ

جواہر مضیئہ کے مصنف نے عافیہ بن یزید کے تذکرہ میں اسحٰق سے روایت کی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے اصحاب کسی مسئلہ میں بحث کرتے ہوتے اور عافیہ موجود نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے کہ عافیہ کو آلینے دو، جب وہ آلیتے اور اتفاق کرتے، تب وہ مسئلہ درج تحریر کیا جاتا، اس طرح تیس برس کی مدت میں یہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچا، امام صاحب کی اخیر عمر قید خانہ میں گذری، وہاں بھی یہ کام برابر جاری رہا۔

اس مجموعہ کا رواج

اس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ ابوالمحاسن نے بیان کی ہے۔ یہ تھی اول باب الطہارۃ، باب الصلوٰۃ، باب الصوم پھر عبادات کے اور ابواب، اس کے بعد معاملات، سب سے اخیر میں باب المیراث۔

امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسنِ قبول حاصل کیا کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے۔ جس قدر اس کے اجزاء تیار ہوتے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ تمام ملک میں اس کی اشاعت ہوتی جاتی تھی، امام صاحب کی درسگاہ ایک قانونی مدرسہ تھا، جس کے طلبہ نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے اور ان کے آئینِ حکومت کا یہی مجموعہ تھا، تعجب ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحب سے ہمسری کا دعویٰ تھا وہ بھی اس کتاب سے بے نیاز نہ تھے۔ امام سفیان ثوری نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے، زائدہ کا بیان

ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی، جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے ان سے اجازت مانگ کر میں اس کو دیکھنے لگا تو ابوحنیفہؒ کی کتاب الرہن نکلی، میں نے تعجب سے پوچھا کہ "آپ ابوحنیفہؒ کی کتابیں دیکھتے ہیں"۔ بولے "کاش ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں"۔

یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ اس وقت بڑے بڑے مدعیانِ فن موجود تھے، اور ان میں بعض امام ابوحنیفہ سے مخالفت بھی رکھتے تھے، تاہم کسی کو اس کتاب کی رد و قدح کی جرأت نہیں ہوئی، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں۔

ان اصحاب الرای اظہر ومذہبہم وکانت الدنیا مملوۃ من المحدثین ورواۃ الاخبار ولم یقدر احد عنہم الطعن فی اقاویل اصحاب الرائے۔

یعنی اصحاب الرائے ابوحنیفہ اور اُن کے تلامذہ نے اپنے مسائل جس زمانہ میں ظاہر کئے، دنیا محدثین اور راویانِ اخبار سے بھری ہوئی تھی۔ تاہم کسی کو یہ قدرت نہ ہوئی کہ ان کے اقوال پر اعتراض کرتا"۔ امام رازی نے تو عام نفی کی ہے، لیکن ہم کو زیادہ استقصا سے معلوم ہوا کہ اس عموم میں ایک استثناء ہے۔ کیونکہ بیہقی نے تصریح کی ہے کہ امام اوزاعی نے ابوحنیفہ کی کتاب السیر کا رد لکھا تھا، جس کا جواب قاضی ابویوسف نے لکھا۔

غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا، اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا، قلائد عقود العقیان کے مصنف نے کتاب الصیانہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے"۔ شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ "یہ مسائل چھ لاکھ تھے"۔ یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی، امام محمدؒ کی جو کتابیں آج موجود ہیں ان سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

امام صاحب کے زمانہ میں جو مجموعہ فقہ مرتب ہوا تھا وہ معدوم ہو گیا

اگرچہ اس میں کسی طرح شبہ نہیں ہو سکتا کہ امام ابو حنیفہ کی زندگی ہی میں فقہ کے تمام ابواب مرتب ہو گئے تھے، رجال و تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کا انکار گویا تواتر کا انکار ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے اور دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ "ابو حنیفہ ؒ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی"، امام رازی نے سنہ ۶۰۶ھ میں انتقال کیا اس لحاظ سے کم از کم چھ سو برس ہو گئے کہ امام ابو حنیفہ ؒ کی تصنیفات ناپید ہو چکیں، امام صاحب کی تصنیفات کا ضائع ہو جانا اگرچہ کچھ محل تعجب نہیں، اس عہد کی ہزاروں کتابوں میں سے آج ایک کا بھی وجود نہیں، امام اوزاعی، ابن جریج، ابن عروبہ، حماد بن ابی معمران کی تالیفات عین اسی زمانہ میں شائع ہوئیں، جب امام ابو حنیفہ کا دفتر فقہ مرتب ہو رہا تھا، تاہم ان کتابوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا لیکن امام ابو حنیفہ کی تصنیفات کی گمشدگی کی ایک خاص وجہ ہے، امام صاحب کا مجموعہ فقہ اگرچہ بجائے خود مرتب اور خوش اسلوب تھا، لیکن قاضی ابو یوسف و امام محمد نے انہی مسائل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا، اور ہر مسئلہ پہ استدلال و برہان کے ایسے حاشیے اضافہ کئے کہ انہی کا رواج عام ہو گیا، اور اصل ماخذ سے لوگ بے پروا ہو گئے، ٹھیک اسی طرح کہ متاخرین نحویوں کی تصنیفات کے بعد فراء، کسائی، خلیل، اخفش، ابو عبیدہ کی کتابیں دنیا سے بالکل ناپید ہو گئیں، حالانکہ یہ لوگ فن نحو کے بانی اور مدون اول تھے۔

امام صاحب کے مسائل کا آج جو ذخیرہ دنیا میں موجود ہے وہ امام محمد اور قاضی ابو یوسف کی تالیفات ہیں، جن کے نام اور مختصر حالات ان بزرگوں کے ترجمہ میں ہم لکھیں گے۔

یہ فقہ اگرچہ عام طور سے فقہ حنفی کہلاتی ہے، لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام ابوحنیفہ، زفر، قاضی ابویوسف، امام محمد کی رایوں کا مجموعہ ہے، قاضی ابویوسف و امام محمد نے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے، فقہائے حنفیہ نے روایتیں نقل کی ہیں کہ ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ ہم نے جو اقوال امام ابوحنیفہ کے خلاف کہے وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کے اقوال ہیں کیوں کہ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ نے متعدد اور مختلف رائیں ظاہر کی تھیں"۔ یہ اُن فقہا کا حسن ظن ہے، قاضی ابویوسف اور امام محمد اجتہاد مطلق کا منصب رکھتے تھے، اور ان کو اختلاف کا پورا حق حاصل تھا۔ اسلام کی ترقیاں اسی وقت تک رہیں کہ لوگ باوجود حسن عقیدت کے بزرگوں اور استادوں کی رائے سے علانیہ مخالفت کرتے تھے اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی۔

یہ مسائل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں، نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گئے، عرب میں تو چنداں ان مسائل کو رواج نہ ہوا۔ کیونکہ مدینہ میں امام مالک اور مکہ میں اور ائمہ ان کے حریف مقابل موجود تھے، لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامی میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تک تھی، عموماً ان ہی کا طریقہ جاری ہو گیا، ہندوستان، سندھ، کابل، بخارا وغیرہ میں تو ان کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ دوسرے ممالک میں گو شافعی و حنبلی فقہ کا رواج ہوا، لیکن فقہ حنفی کو دبا نہیں سکا، البتہ بعض ملکوں میں وہ بالکل معدوم ہو گیا۔ اور اس کے خاص اسباب تھے، مثلاً افریقہ میں ۴۰۵ھ تک امام ابوحنیفہ کا طریقہ تمام طریقوں پر غالب تھا لیکن معز بن بادیس نے ۴۰۶ھ میں جب وہاں کی مستقل حکومت قائم کی تو حکومت کے زور سے تمام ملک میں مالکی فقہ کو رواج دے دیا کہ آج تک قائم ہے۔

سلاطین اکثر حنفی تھے

ایک خاص بات یہ ہے کہ عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ اکثر حنفی ہی فقہ کے پابند تھے۔

خلفائے عباسیہ اس بحث سے خارج ہیں، کیونکہ یہ خاندان جب تک اوج پر رہا، یہ لوگ تلوار کے ساتھ قلم کے بھی مالک رہے، یعنی ان کا دعویٰ اجتہاد تھا اور کبھی کسی کی تقلید نہیں کی، تنزل کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہے۔ کہ ان کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے تاہم ان میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو ابوحنیفہ ہی کی کی، عبداللہ بن المعتز جو فن بدیع کا موجد تھا۔ اور خلفائے عباسیہ میں سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا، حنفی المذہب تھا۔[1] عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندانوں کو عروج ہوا، اکثر حنفی تھے، خاندان سلجوقی جس نے ایک وسیع مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرہ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک پہنچی تھی حنفی تھا، محمود غزنوی جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے، فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا، فن فقہ میں اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے، جس کا نام التفرید ہے اور جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔

نورالدین زنگی کا نام چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ ہمارے ہیروز میں داخل ہے بیت المقدس کی لڑائیوں میں اوّل اسی نے نام حاصل کیا، صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس اسی کے دربار میں ملازم تھا، دنیا میں پہلا دارالحدیث اسی نے قائم کیا، اگرچہ وہ شافعی و مالکی فقہ کی عزت کرتا تھا، لیکن وہ خود اور اسکا تمام خاندان مذہباً حنفی تھا، صلاح الدین خود شافعی تھا، لیکن اس کے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے، الملک المعظم عیسےٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا، علامہ ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "وہ نہایت، عالی ہمت، فاضل، ہوشمند، دلیر، پُر رعب تھا، اور حنفی مذہب میں غلو رکھتا تھا۔" چراکسہ مصر نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے اور ۱۴۸ برس تک فرمانروا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ خود حنفی تھے اور ان کے

---

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبداللہ بن المعتز۔

دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ تھا، سلاطینِ ترک جو کہ کم وبیش چھ سو برس سے روم کے فرمانروا رہے اور صدیوں انہی کی سلطنت اسلام کی عزت ووقار کی امید گاہ رہی۔ عموماً حنفی تھے، خود ہمارے ہندوستان کے فرمانروا خواتین اور آلِ تیمور اسی مذہب کے پابند رہے۔ اور ان کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہو سکا۔

حنفی مذہب کے حسن قبولیّت کا سبب

بعضوں کا خیال ہے کہ حنفی مذہب کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ حکومت کے صدقہ سے ہوا، ابن حزم جو اربابِ ظاہر کے مشہور امام ہیں ان کا قول ہے کہ "دو مذہبوں نے سلطنت کے زور سے ابتدا ہی میں رواجِ عام حاصل کیا، ایک ابو حنیفہ کا مذہب کیونکہ جب قاضی ابو یوسف کو قاضی القضاۃ کا منصب ملا تو انہوں نے حنفی لوگوں کو عہدۂ قضا پر مقرر کیا، دوسرا امام مالک کا مذہب اندلس میں ——— کیونکہ امام مالک کے شاگرد یحییٰ اصمودی خلیفہ اندلس کے نہایت مقرب تھے اور کوئی شخص بے ان کے مشورے کے عہدۂ قضا پر مقرر نہیں ہو سکتا تھا، وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کو مقرر کراتے تھے۔"

لیکن یہ ابنِ حزم کی ظاہر بینی ہے، امام ابو حنیفہ سنہ ۱۲۰ھ میں مسندِ اجتہاد پر بیٹھے قاضی ابو یوسف نے سنہ ۱۷۰ھ کے بعد قاضی القضاۃ کا منصب حاصل کیا۔ کیونکہ ان کے تقرر اور عروج کا زمانہ ہارون الرشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو سنہ ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، قاضی ابو یوسف کے فروغ سے پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا، جس میں امام ابو حنیفہ کے مذہب نے قبولِ عام حاصل کر لیا تھا اور ان کے سینکڑوں شاگرد قضا کے عہدوں پر مامور ہو چکے تھے، اس کامیابی کو کس طرف منسوب کیا جائے؟ یہ ضرور ہے کہ قاضی ابو یوسف کی وجہ سے امام صاحب کے مسائل کو اور زیادہ

عروج ہوا، لیکن مذہب حنفی کا اصلی عروج قاضی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا۔ امام رازی نے باوجود مخالفت کے تسلیم کیا ہے کہ ثم انہ لما قوی مذہب اصحاب الرای واشتہر وعظم وقعتہ فی القلوب ثم اتفق اتصال ابی یوسف ومحمد بخدمۃ ھارون الرشید عظمت تلک القوۃ جدا لان العلم والسلطنۃ حصلا معاً یعنی اصحاب الرائے کا مذہب قوی ہو گیا اور شہرت پکڑے گیا اور اس کی وقعت دلوں میں بہت ہی زیادہ بڑھ گئی، کیونکہ علم اور حکومت دونوں مجتمع ہو گئے"۔

اس کے علاوہ قاضی ابو یوسف کا اثر ہارون الرشید کے زمانہ تک محدود تھا، دیرپا اور غیر منقطع کامیابی کس نے پیدا کی؟ یوں تو بعض اور ائمہ نے بھی اپنے عہد میں نہایت عروج حاصل کیا تھا، امام اوزاعی اپنی زندگی میں بلکہ زمانۂ بعد تک بھی تمام شام کے امام مطلق تسلیم کئے گئے اور ان ممالک میں لوگ عموماً ان ہی کی تقلید کرتے تھے، لیکن وہ ایک محدود اثر تھا جو بہت جلد جاتا رہا، ان واقعات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مذہب میں ایسی خاص خوبیاں ہیں جو اور مذہبوں میں نہیں۔

دوسرے مجتہدین کے رواج مذہب کے اسباب

تمام ممالک اسلامی میں جن ائمہ کی فقہوں نے رواج پایا وہ صرف چار ہیں، ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل، مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب اگرچہ خود ان مسائل کی خوبی و عمدگی پر ہے، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس امر میں واضع فقہ کے ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے، ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہ کے سوا اور مجتہدین فقہ کی ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر ان کی ذاتی خصوصیتیں تھیں، مثلاً امام مالک مدینہ کے رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفائے راشدین کا دار الخلافہ رہ چکا تھا، اس تعلق سے لوگوں کو عموماً مدینہ اور ارباب مدینہ کے ساتھ خلوص و عقیدت تھی، ان کا خاندان ایک علمی خاندان تھا ان کے دادا مالک بن

ابی عامر نے بڑے بڑے صحابہ سے حدیثیں سیکھیں تھیں، ان کے چچا شیخ الحدیث تھے۔

امام مالک نے جب حدیث و فقہ میں کمال پیدا کیا تو یہ عارضی اوصاف ان کی ذاتی قابلیت کا طرہ بن کر نمایاں ہوئے اور تمام اطراف و دیار میں ان کی شہرت کا سکہ جم گیا۔

امام شافعی کو اور بھی زیادہ خصوصیتیں حاصل تھیں، مکہ معظمہ وطن تھا، باپ کی طرف سے قریشی اور مطلبی اور ماں کی طرف سے ہاشمی تھے، ان کا تمام خاندان ہمیشہ سے معزز و ممتاز چلا آتا تھا، ان کے پر دادا، سائب جنگ بدر میں ہاشمیوں کے علم بردار تھے اور گرفتار ہو کر اسلام لائے تھے، مکہ معظمہ کی ولایت، خاندان کا اعزاز رسول اللہ (صلعم) کی ہم نسبی، ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسن قبول اور مرجعیت کے لئے کوئی کارگر آلہ نہیں ہو سکتا تھا،

امام ابو حنیفہؒ میں اس قسم کی کوئی خصوصیت نہ تھی، قریشی اور ہاشمی ہونا تو ایک طرف وہ عربی النسل بھی نہ تھے، خاندان میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا تھا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدر رہتا، آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اسی ذریعہ سے زندگی بسر کی کوفہ جو اُن کا مقام ولادت تھا گو دار العلم تھا لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا ہمسر کیونکر ہو سکتا تھا، بعض اتفاقی اور ناگزیر اسباب سے ارباب روایات کا ایک گروہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھا، غرض حسن قبول اور عام اثر کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے، باوجود اس کے ان کی فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے۔ کہ اُن کا طریقۂ فقہ انسانی ضرورتوں کے لیے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا۔ اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جس قدر ان کی فقہ کو مناسبت تھی۔ کسی کی فقہ کو نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اور ائمہ کے مذہب کو زیادہ تر انہی ملکوں میں رواج ہوا، جہاں تہذیب و تمدن نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ علامہ ابن خلدون اس بات کی وجہ بتاتے ہیں۔ کہ مغرب و اندلس میں امام مالک

مذہب کیوں زیادہ رائج ہوا' وہ دیکھتے ہیں۔ کہ مغرب واندلس میں بدویت غالب تھی اور وہاں کے لوگوں نے وہ ترقی نہیں حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان ممالک میں امام مالک کی فقہ کے سوا اور کسی   نہ ہو سکا۔

حنفی فقہ جس میں امام ابوحنیفہ کے علاوہ ان کے نامور شاگردوں کے مسائل بھی شامل ہیں۔ اس زمانہ کا بہت بڑا قانون بلکہ بہت بڑا مجموعہ قوانین تھا زمانہ مابعد میں گو علمائے حنفیہ نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا۔ اور جزئیات کی تفریع کی جو حالت ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو امام ابوحنیفہ کے عہد میں فقہ کو حاصل ہو چکی تھی۔ اس مجموعہ میں عبادات کے علاوہ دیوانی فوجداری' تعزیرات' لگان مال گذاری' شہادت معاہدہ' وراثت' وصیت اور بہت سے قوانین شامل تھے اس کی وسعت اور خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ ہارون الرشید اعظم کی وسیع سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی' انہی اصول پر قائم تھی۔ اور اس کے عہد کے تمام واقعات اور معاملات انہی قواعد کی بنا پر فیصل ہوتے تھے۔

مسائل فقہ کی تفسیر

یہ قانون جس کو فقہ کہتے ہیں۔ دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کی دو مختلف حیثیتیں ہیں:

۱۔ وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں اور تشریعی احکام کہے جا سکتے ہیں۔

۲۔ وہ احکام جن سے شریعت نے سکوت کیا ہے۔ اور جو تمدن اور معاشرت کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا جن کا ذکر شریعت میں ہے۔ لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہ کی حیثیت شارح اور مفسر کی حیثیت ہے اس اعتبار سے اس کے لئے جس قسم کی قابلیت درکار ہے۔ وہ مہارت زبان واقفیت نصوص' قوت استنباط' توفیق متعارضات ترجیح دلائل ہے۔ لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

دوسری قسم کے احکام کے لحاظ سے واضع فقہ ایک مقنن کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور اس لحاظ سے اس کی قابلیت اس رتبہ کی ہونی چاہیئے۔ جیسی کہ دنیا کے اور مشہور مقننوں کی تھی۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسری سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں بہت سے نامور گذرے ہیں۔ جو قرآن و حدیث کے عمدہ مفسر یا شارح تھے۔ لیکن مقننانہ قابلیت سے معرا تھے۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی گذرے ہیں۔ جو مقنن اور واضع قانون تھے۔ لیکن نصوص شرعی کے مفسر نہیں کہے جا سکتے تھے، جہاں تک کہ ہماری واقفیت ہے۔ اسلام کے اس وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلیٰ درجہ پر امام ابوحنیفہؒ میں جمع کر دی تھیں کسی مجتہد یا امام میں جمع نہیں ہوئیں۔

علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام امام صاحب نے جو کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

تشریعی وغیر تشریعی احادیث کا فرق

شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال جو سلسلۂ روایت سے منضبط کئے گئے۔ ان میں بہت سے ایسے امور تھے۔ جن کو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ لیکن بطور ایک اصطلاح کے ان سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ فقہ کی توضیح میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان تمام امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا، اور اس خیال سے ان پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ آنحضرت (صلعم) سے جو کچھ روایت کیا گیا ہے۔ اور کتب حدیث میں اس کی تدوین ہوئی۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ جو تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی بارہ میں یہ آیت اتری ہے۔ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا۔ یعنی "پیغمبر جو تم کو دے اس کو اختیار کرو۔ اور جس چیز سے روکے اس سے باز آؤ۔"

۲۔ جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں، چنانچہ ان کی نسبت آنحضرت (صلعم) نے ارشاد فرمایا ہے۔ انما انا بشر اذا امرتکم بشی من دینکم فخذوہ و اذا امرتکم بشی من رایی فانما انا بشر" یعنی میں ایک آدمی ہوں۔ جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اُس کے پابند رہو اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں"۔ اُس دوسری قسم میں وہ افعال داخل ہیں۔ جو آنحضرت (صلعم) سے عادتاً صادر ہوئے نہ عبادۃً اور اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً اور اسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں۔ جو آنحضرت صلعم نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث اور اسی قسم میں وہ امور داخل ہیں۔ جو آنحضرت (صلعم) نے اس وقت مصلحت جزی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں۔ مثلاً فوجوں کی تیاری اور شعار کی تعیین، اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ کہ اب رمل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جس قوم کو دکھانے کے لئے ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا"۔ اور آنحضرت (صلعم) کے بہت سے احکام اسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ حکم کہ جہاد میں جو شخص کسی کافر کو قتل کرے تو اس کے ہتھیار کا مالک بھی وہی ہوگا۔"

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا، یہ وہی نکتہ ہے۔ جس کی طرف سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کا ذہن منتقل ہوا۔ اسی بنا پر بہت سے مسائل مثلاً غسل جمعہ، خروج النساء الی العیدین، نفاذ طلاق، تعیین جزیہ، تشخیص خراج، تقسیم غنائم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں۔ ان کو امام ابو حنیفہ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے۔ لیکن امام شافعی وغیرہ ان حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے، وہ یہی ہے کہ اس کے مسائل عموماً اسی قاعدے پر مبنی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ وسعت

اور آزادی پائی جاتی ہے، جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی، یہ قاعدہ اگرچہ نہایت صاف اور صریح ہے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ اور ائمہ نے اس پر لحاظ نہیں کیا، اور اگر خلفائے راشدین کی نظیریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابو حنیفہ کو بھی اس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اگرچہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ائمہ نے جن کو ان کے مقابلہ میں اجتہاد کا دعویٰ تھا، اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی، اور اسی غلط خیال پر قائم رہے، لیکن اس میں کون شبہ کر سکتا ہے، کہ امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور دقیقہ سنجی پر مبنی تھی۔

جو مسائل تشریعی مسائل نہیں ہیں

خلفائے راشدین سے بڑھ کر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہو سکتا ہے، انہوں نے کیا کیا! حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک، امہات اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہو چکی ہو، عموماً خریدی اور بیچی جاتی تھیں، حضرت عمرؓ نے اس رواج کو بالکل روک دیا۔ آنحضرت (صلعم) نے تبوک کے سفر میں غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ فی کس ایک دینار تھا، حضرت عمرؓ نے ایران میں ۴۸، ۱۲، ۶ کے حساب سے شرحیں مقرر کیں۔ آں حضرت (صلعم) مال غنیمت جب تقسیم کرتے تھے تو اپنے عزیز و اقارب کا بھی حصہ لگاتے تھے، خلفائے راشدین میں سے کسی نے حتی کہ حضرت علیؓ نے بھی ہاشمیوں کو کبھی حصہ نہیں دیا۔ آنحضرت (صلعم) کے زمانہ میں بلکہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد تک تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں منادی کرا دی، کہ تین طلاق بائن سمجھی جائے گی۔ آنحضرت (صلعم) کے عہد میں شراب پینے کی سزا میں کوئی خاص حد نہیں مقرر ہوئی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس کی حد چالیس درے قرار دیئے اور حضرت عمرؓ نے بسبب اس کے کہ ان کے زمانہ میں مے نوشی کا زیادہ رواج ہو چلا تھا۔ چالیس سے اسی درے کر دیئے، یہ وہ واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کے

ثبوت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا، لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خلفائے راشدین کسی حکم کو آں حضرت (صلعم) کا تشریعی حکم سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اگر نعوذ باللہ ایسا کرتے تھے تو وہ خلفائے راشدین نہ تھے، بلکہ عیاذاً باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حریف اور مقابل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رات دن آنحضرت (صلعم) کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، اور فیض صحبت کی وجہ سے شریعت کے ادا شناس ہو گئے تھے، ان کو یہ تمیز کرنا نہایت آسان کام تھا کہ کون سے احکام تشریعی حیثیت رکھتے ہیں، اور کون سے اس حد میں داخل ہیں، جن کی نسبت آں حضرت (صلعم) نے فرمایا تھا کہ انتم علم بامور دنیاکم حضرت عائشہؓ نے آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد ایک موقع پر کہا کہ آج اگر رسول اللہ موجود ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہ دیتے" یہ صریح اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ کی اس اجازت کو تشریعی اور لازمی قرار نہیں دیا، ورنہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے اس پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

امام ابوحنیفہ نے اس مرحلہ میں صحابہ ہی کو دلیل راہ بنایا اور اس قسم کے مسائل میں ان کی رائے عموماً خلفائے کے طرز عمل کے موافق ہے، لیکن جن لوگوں کی نگاہ اس نکتہ تک نہیں پہنچی وہ امام ابوحنیفہ بلکہ صحابہ کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں، طلاق کے مسئلہ میں قاضی شوکانی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کرکے لکھا ہے کہ "رسول اللہ کے مقابلے میں بے چارے عمرؓ کی کیا حقیقت ہے"۔ لیکن قاضی شوکانی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمرؓ قاضی صاحب سے زیادہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ رسولؐ کے مقابلہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

فقہ کی پہلی قسم کے متعلق امام ابوحنیفہ نے جو بڑا کام کیا وہ قواعد استنباط کا انضباط

تھا، جس کی وجہ سے فقہ (جو اب تک جزئیات مسائل کا نام تھا۔ ایک مستقل فن بن گیا، امام ابوحنیفہؒ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر اور تعجب انگیز ہے۔ وہ ان قواعد کی تحدید اور انضباط ہے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ علوم نہایت ابتدائی حالت میں تھے یہاں تک کہ نقل و کتابت کا بھی رواج نہ تھا۔ ایسے دقیق فن کی بنیاد ڈالنی درحقیقت امام ابوحنیفہ ہی کا کام تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جن کو اب اصولِ فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے امام شافعی نے مرتب کئے، یہ دعویٰ اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعی سے پہلے یہ مسائل مستقل طور سے حیزِ تحریر میں نہیں آئے تھے، لیکن اصولِ فن کی بنیاد امام شافعیؒ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی، اور اگر تحریر کی قید اٹھا دی جائے تو امام ابوحنیفہ اس کے موجد کہے جا سکتے ہیں۔

استنباطِ احکام کی ابتدا

اصل یہ ہے کہ مسائل کا استنباط اور احکام کی تفریع تابعین بلکہ صحابہ ہی کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی۔ لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا وہ کوئی علمی صورت نہیں رکھتا تھا۔ جس طرح عام لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا اور کسی قسم کی تفریع صرف وجدانی مذاق کی رو سے کرتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ان کا استنباط یا تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہے اور اس کے کیا شرائط اور قیود ہیں، اسی طرح فقہی مسائل بھی استنباط کیے جاتے نہ علمی اصطلاحیں قائم ہوئی تھیں۔ نہ کچھ اصول منضبط ہوئے تھے۔

واصل بن عطاء نے فقہ کے بعض قاعدے بیان کیے

بنی اُمیہ کے اخیر دور میں کچھ علمی اصطلاحیں پیدا ہوئیں، چنانچہ واصل بن عطا نے جو علمِ کلام کا موجد تھا، احکامِ شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ "حق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں، قرآنِ ناطق، حدیثِ متفق علیہ

اجماعِ اُمت، عقل و حجت (یعنی قیاس) واصل نے اور بھی چند مسائل اور اصطلاحیں قائم کیں مثلاً یہ کہ عموم و خصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں" نسخ صرف اوامر و نواہی میں ہو سکتا ہے اخبار و واقعات میں نسخ کا احتمال نہیں"۔

ان مسائل کے لحاظ سے اصولِ فقہ میں اولیت کا فخر واصل کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ اسی قسم کی اولیت ہو گی جس طرح نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فنِ نحو کے موجد ہیں، بہرحال امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک جو کچھ ہوا تھا، اُس سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن چونکہ امام صاحب نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا اس لئے استنباط اور استخراجِ مسائل کے اصول قرار دینے پڑے۔

اصولِ فقہ کی کلیات

اگرچہ زمانہ مابعد میں اصولِ فقہ ایک نہایت وسیع فن بن گیا اور سینکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہو گئے ہیں جن کا امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں اثر بھی نہ تھا، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن کے مہمات مسائل جن پر فن کی بنیاد قائم ہے امام صاحب ہی کے زمانہ میں منضبط ہو چکے تھے اصول اربعہ کی توضیح، حدیث کے مراتب اور ان کے احکام، جرح و تعدیل کے اصول اجماع کے حدود و ضوابط، قیاس کے احکام و شرائط، احکام کی تشریح عموم و خصوص کی تحدید، رفع تعارض کے قواعد، فہم مراد کے طرق یہ ایسے مسائل ہیں جو اصول فقہ کے ارکان ہیں، ان تمام مسائل کے متعلق امام صاحب نے ضروری اصول و قواعد منضبط کر دیئے تھے۔

حدیث کے متعلق امام صاحب نے جو اصول قرار دیئے ان کو ہم حدیث کی بحث میں لکھ آئے ہیں، ان کے علاوہ اور ابواب کے متعلق امام صاحب نے تمام ضروری اصول منضبط کر دیئے تھے، مثلاً۔

مالم یثبت بالتواتر لیس بقرآن الزیادۃ نسخ لا یجوز الزیادۃ علی الکتاب بخبر واحد حمل المطلق علی المقید زیادۃ علی النص عموم القرآن لا یتخصص بالاحاد العام قطعی کالخاص ان کان متاخراً خصص العام وان کان متقدماً فلا بل کان العام ناسخاً للخاص وان کان جهل التاریخ تساقطا یطلب دلیل آخر مفهوم لا یحتج بہ لا تدل علی البطلان۔

امام صاحب کے یہ اقوال ان شاگردوں کی تصنیفات یا اصول کی کتابوں میں جو شافعیہ وحنفیہ وغیرہ نے لکھے ہیں جستہ جستہ مذکور ہیں جن کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر رسالہ تیار ہو سکتا ہے[1]۔ یہی اصول ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ ایک خاص طریقہ اجتہاد کے بانی ہیں، انہی اصول کے اتحاد کی بنا پر امام محمد وقاضی ابو یوسف کا طریقہ امام صاحب کے طریقہ سے الگ نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ جزئیات مسائل میں لوگوں نے سینکڑوں ہزاروں جگہ ان سے اختلاف کیا ہے۔

ان اصولی مسائل پر بوجہ اس کے کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے ان سے مخالفت کی ہے۔ نہایت وسیع اور دقیق بحثیں قائم ہو گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری مختصر بحث میں ان کی گنجائش نہیں، اصول کی کتابوں میں یہ مباحث نہایت تفصیل سے مذکور ہیں۔ جس شخص کا جی چاہے ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں

---

[1] لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں جو بہت سے اصول مذکور ہیں۔ ان سب کی نسبت یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے اقوال ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر ایک نہایت عمدہ تقریر لکھی ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے بعض ان اقوال سے بھی انکار کیا ہے۔ جو بروایت صحیحہ امام صاحب سے ثابت ہیں۔

فقہ کے اس حصہ میں امام صاحب کی حیثیت ایک مفسر اور مستنبط کی حیثیت ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس باب میں امام نے جو کام کیا وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ دنیا میں اور بھی قومیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتابیں ہیں اور وہ لوگ ان کتابوں سے اخذِ احکام کرتے ہیں، لیکن کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے استنباطِ مسائل کے اصول اور قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک مستقل فن کے رتبہ تک پہنچا دیا۔

فقہ حنفی تعزیرات و قوانین ملکی کی حیثیت سے

فقہ کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے، پہلے حصہ کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور یہ وہ خاص حصہ ہے جس میں امام ابو حنیفہ رح علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں بلکہ سچ ہے۔ کہ اگر اسلام میں کوئی شخص واضع قانون گذرا ہے، تو وہ صرف امام ابو حنیفہ ہیں امام ابو حنیفہ رح اس وصف میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، مرجعیت اور فصل قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات ان کی نگاہ سے گذر چکے تھے ان کی مجلس افتا بہت بڑی عدالتِ عالیہ تھی۔ جس نے لاکھوں مقدمات کا فیصلہ کیا تھا، وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی۔ اور ارکانِ سلطنت، مہمات امور میں ان سے مشورہ لیتے تھے، ان کے شاگرد اور ہمنشین جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ تھی۔ عموماً وہ لوگ تھے جو منصب قضا پر مامور تھے، ان باتوں کے ساتھ خود ان کی طبیعت مقننانہ اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی، وہ ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اس کے دقیق نکتوں تک پہنچتے تھے۔ اس بات کا اندازہ واقعات سے ہو سکتا ہے، جن کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے۔

اب ہم ان خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

فقہ حنفی کا اصول عقلی کے موافق ہونا

(۱) سب سے مقدم اور قابلِ قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے

مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہوتا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں، یعنی ان میں کوئی سر اور مصلحت نہیں ہے، مثلاً شراب خواری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں، کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے، اور خیرات و زکوٰۃ صرف اس لیے مستحسن ہیں کہ شارع نے اس کی تاکید کی ہے، ورنہ فی نفسہٖ یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اور شاید اسی کا اثر تھا، کہ ابوالحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں، علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے، لیکن درحقیقت و مصلحت سے خالی نہیں، یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کیے ہیں۔ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا، تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرزِ استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ روزہ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول ان کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے۔ کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقلی کے مطابق ہے۔ اور کوئی فقہ نہیں، امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے، اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق خبر سے ثابت کیا جائے، محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے۔ اور

اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابو حنیفہ سے مخالفت کی ہے، لیکن اکثر مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب احادیث اور طریق نظر دونوں کے موافق ہے"، امام محمد نے بھی کتاب الحج میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے، یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں، اور ہر جگہ ملتی ہیں، جس کو تفصیل مقصود ہو، ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

اس دعویٰ سے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے، شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے، ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔

امام رازی کا استدلال

امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے، کہ امام شافعی کا مذہب امام ابو حنیفہ سے زیادہ صحیح ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی کا مذہب عقل وقیاس سے بعید ہے اور یہی اس کی صحت کی دلیل ہے، کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں جن میں عقل درائے کو دخل نہیں۔

بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابو حنیفہ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا، دوسرے ائمہ جنہوں نے فقہ کی تدوین وترتیب کی ان کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی، بخلاف اس کے امام ابو حنیفہ رح کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی جس کی ممارست نے ان کی قوت فکر اور حدتِ نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا، معتزلہ وغیرہ جن سے ان کے معرکے رہتے تھے، عقلی اصول کے پابند تھے اس لئے امام صاحب کو بھی ان کے مقابلہ میں انہی اصول سے کام لینا پڑتا تھا، اور متنازع فیہ مسئلوں میں مصالح واسرار کی خصوصیتیں دکھانی پڑتی تھیں۔ اس غور اور تدقیق، مشق ومہارت سے ان کو ثابت ہوگیا تھا، کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول

عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہی جستجو رہی۔

حنفی فقہ کے مسائل کا دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات میں بھی، جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کیے گئے ہیں۔ اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہیئے تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا۔ جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے (یعنی خضوع، اظہار تعبد، اقرارِ عظمت الٰہی دعا) اور اس کے حاصل ہونے میں کن افعال کو کس نسبت سے دخل ہے؟ ان افعال کے مراتب مختلف ہیں، بعض لازمی اور ضروری ہیں، کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقہ ادا ہیں صرف ایک حسن و خوبی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی، ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے اور ان کو سنت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرض و واجب و سنت کی تصریح نہیں فرمائی، لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا تھا، کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز مراتب پر توجہ کی، اور استنباط و اجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کیے

اور ان کے جدا جدا نام رکھے، امام ابوحنیفہؒ نے بھی ایسا ہی کیا، لیکن اس باب میں ان کو اور ائمہ پر جو ترجیح ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا۔ درحقیقت ان کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی، کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے۔ اس لیے اس قدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلم رہا کہ نیت، تکبیر، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ فرض اور لازمی ہیں۔ اور خود شارع نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کیے بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ارکان کی ادا کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دے دیا، حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہؒ ان کی فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہُ اکبر کے سوا اور الفاظ سے بھی ادا ہو سکتی ہے، جو اس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اَعظمُ اللہُ اَجلُ) امام شافعی کے نزدیک نہیں ہو سکتی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بغیر سورہ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو شخص عربی میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے، وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے[1]

---

[1] امام محمد نے جامع صغیر میں جو روایت کی ہے اس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین نے امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے۔ کہ وہ قرآن کی حقیقت و مفہوم میں الفاظ کو داخل نہیں سمجھتے۔ یعنی ان کے نزدیک صرف قرآن کے معنی پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے"۔ بے شبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن فقہ حنیفہ نے دعویٰ کیا ہے۔ کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہو سکتی۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ امام ابوحنیفہؒ یا کسی مجتہد نے صرف عقل و قیاس سے نماز کے ارکان متعین کیئے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لیے عموماً احادیث کی تصریحات و اشارات سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں، ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں اسی طرح عقلی وجوہ بھی ان کی صحت کے شاہد ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار و مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

زکوٰۃ کے مسائل اور فقہ حنفی

زکوٰۃ کے مسائل کا بھی یہی حال ہے، زکوٰۃ کا اصلی مقصد بنی نوع انسان کی ہمدردی اور اعانت ہے، اسی لیے زکوٰۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں، یعنی فقرا و مساکین، عمالِ زکوٰۃ مولفۃ القلوب، مقروض، مسافر، غازی، مکاتب۔ چونکہ ان لوگوں کی تصریح خود قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اسی لئے اس امر میں سب مجتہدین کا اتفاق رہا کہ یہ لوگ مصرف زکوٰۃ ہیں لیکن تعیین نے ایک اختلاف پیدا کر دیا، امام شافعیؒ نے ان اقسام کے ذکر سے یہ خیال کیا کہ یہ سب اشخاص زکوٰۃ کے ادا میں لازمی ہیں۔ یعنی جب تک ان آٹھوں اقسام کے لوگوں کو زکوٰۃ ادا نہ کی جائے، فرض ادا ہی نہیں ہو سکتا، بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ زکوٰۃ ان اقسام سے باہر نہ جانے پائے باقی یہ امر کہ ان لوگوں میں سے سب کو دی جائے یا بعض کو، یہ امر مقتضائے وقت اور ضرورت پر موقوف ہے۔ امام اور حاکم وقت ضرورت کے لحاظ سے جس کو چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔

حنفی فقہ کا آسان اور سہل ہونا

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حنفی فقہ بہ نسبت تمام اور فقہوں کے نہایت آسان اور سیر التعمیل ہے۔

قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے کہ "خدا تم لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا"۔ رسول اللہؐ (صلعم) کا قول ہے۔ کہ میں نرم اور آسان شریعت لے کر آیا ہے"۔ بے شبہ اسلام کو تمام اور مذہبوں کے مقابلہ میں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ رہبانیت سے نہایت بعید ہے۔ اس میں عباداتِ شاقہ نہیں ہیں۔ اس کے مسائل آسان اور سیر التعمیل ہیں، حنفی فقہ کو بھی اور فقہوں پر بھی ترجیح حاصل ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے مسائل ایسے آسان اور نرم ہیں۔ جو شریعت سہلہ کی شان ہے۔ بخلاف اس کے اور ائمہ کے بہت سے احکام بہت سخت اور عسیر التعمیل ہیں۔ مثلاً کتاب الجنایات و کتاب الحدود کے مسائل انہی میں سے سرقہ کے احکام ہیں چنانچہ ہم اس کے چند جزئیات نمونہ کے طور پر یہاں لکھتے ہیں۔

اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سرقہ کی سزا قطع ید یعنی ہاتھ کاٹنا ہے لیکن مجتہدین نے سرقہ کی تعریف میں چند شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں، جن کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں ہو سکتی، ان شروط کے لحاظ سے احکام پر جو اثر پڑتا ہے وہ ذیل کے جزئیات سے معلوم ہو گا۔ کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب کس قدر آسان اور تمدن و شائستگی کے کس قدر موافق ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے مسائل	اور ائمہ کے مسائل
نصاب سرقہ کم از کم ایک اشرفی ہے	ایک اشرفی کا ربع
اگر ایک نصاب میں متعدد چوروں کا	امام احمد کے نزدیک ہر ایک کا ہاتھ

امام ابوحنیفہ کے مسائل	اور ائمہ کے مسائل
ساجھا ہے تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔	کاٹا جائے گا۔
نادان بچہ کا قطع ید نہیں	امام مالک کے نزدیک ہے
کفن چور پر قطع ید نہیں	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
زوجین میں سے اگر ایک دوسرے کا مال چرائے تو قطع ید نہیں	امام مالک کے نزدیک ہے۔
بیٹا باپ کا مال چرائے تو قطع ید نہیں	امام مالک کے نزدیک ہے۔
قرابت قریبہ والے مثلاً چچا بھائی وغیرہ پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے
ایک شخص کسی سے کوئی چیز مستعار لے کر انکار کر گیا تو قطع ید نہیں	اور ائمہ کے نزدیک ہے
ایک شخص نے ایک چیز چرائی پھر بذریعہ ہبہ یا بیع اس کا مالک ہو گیا تو قطع ید نہیں	اور ائمہ کے نزدیک ہے
غیر مذہب والے جو مستامن ہو کر اسلام کی عملداری میں رہتے ہیں، ان پر قطع ید نہیں	اور ائمہ کے نزدیک ہے
قرآن مجید کے سرقہ پر قطع ید نہیں	امام شافعی و امام مالک کے نزدیک ہے
لکڑی یا جو چیزیں جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ ان کے سرقہ سے قطع ید لازم نہیں آتا۔	اور ائمہ کے نزدیک لازم آتا ہے۔

فقہ حنفی کے قاعدے نہایت وسیع اور تمدن کے موافق ہیں

۳۔ فقہ کا بہت بڑا حصہ جس سے دنیوی ضرورتیں متعلق ہیں، معاملات کا حصہ ہے۔ اور یہی وہ موقع ہے، جہاں ہر مجتہد کی وقتِ نظر اور نکتہ شناسی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

امام شافعی ہبہ کے لئے قبضہ کو ضروری نہیں سمجھتے، شفعۂ ہمسایہ کو جائز نہیں رکھتے تمام معاملات میں مستور الحال کی شہادت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، گواہان نکاح کے لیے ثقہ اور عادل ہونے کی قید ضروری سمجھتے ہیں۔ ذمیوں کے باہمی معاملات میں بھی ان کی شہادت جائز نہیں قرار دیتے، بے شبہ یہ باتیں ان ممالک میں آسانی سے چل سکتی ہیں، جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی ہے اور معاملات کی صورتیں بالکل سادہ اور نیچرل حالت میں ہیں، لیکن جن ملکوں میں تمدن نے ترقی حاصل کی ہو۔ معاملات کی مختلف پیچ در پیچ صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، حقوق کی تحدید اور انضباط کے بغیر چارہ نہ ہو، وہاں ایسے احکام کا قائم رہنا آسان نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مسائل میں امام ابو حنیفہ رح امام شافعی سے مخالف ہیں، مورخ ابن خلدون نے لکھا ہے۔ کہ امام مالک کا مذہب انہی ممالک میں رواج پا سکا، جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ امام مالک کے مسائل میں اصول تمدن کی رعایت نہ تھی۔

امام ابو حنیفہ نے جس وقتِ نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ معاملات کے احکام منضبط کئے۔ اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہو سکتا ہے، کہ معاملات کے چند ابواب پر ایک مفصل ریویو لکھا جائے، لیکن ایسی تفصیل کے لئے نہ وقت مساعد ہے نہ اس مختصر صحبت میں اس کی گنجائش ہے۔

بمونہ کے طور پر ہم صرف مسائل نکاح کا ذکر کرتے ہیں۔ جو

عباداتِ اور معاملات دونوں کا جامع ہے۔

نکاح کے مسائل

نکاح کو اگرچہ فقہا نے عبادات میں شامل کیا ہے، لیکن یہ صرف ایک اصطلاح ہے، ورنہ نکاح بوجہ اس کے کہ تمدن و معاشرت کے دو بڑے بڑے نتائج اس پر متفرع ہوتے ہیں۔ معاملات کا نہایت ضروری حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نکاح کے مسائل جن اصول پر متفرع ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ کن لوگوں کے ساتھ نکاح ہونا چاہیئے۔
۲۔ معاملۂ نکاح کس اعتبار سے ہونا چاہیئے۔
۳۔ اس کی بقاء و ثبات کا استحکام کس حد تک ضروری ہے
۴۔ فریقین کے بقاؤ ثبات کے حقوق کیا قرار دیئے جائیں۔
۵۔ نکاح کن دستورات اور رسومات کے ساتھ عمل میں آئے۔

یہ امر کہ نکاح کی وسعت کو کس حد تک محدود کیا جائے، تھوڑے سے اختلافات کے ساتھ تمام مذاہب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ چند محرمات قریباً تمام مذہبوں میں مشترک ہیں، جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ امر نہایت صریح اصول عقلی پر مبنی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور فلاسفر بنتھم نے کتاب یوٹلٹی میں محرمات کی حرمت کے جو دلائل قائم کیے ہیں، بالکل مشترک ہیں، چونکہ یہ امر بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے اور قرآن مجید میں محرمات کے نام تصریحاً مذکور ہیں، اس سے اصل مسئلہ میں تمام مجتہدین کا اتفاق رہا، لیکن جو جزئیات ظاہر نص کے ذیل میں نہیں آئیں ان میں اختلاف پیدا ہوگیا، انھی میں حرمت بالزنا کا مسئلہ ہے جو امام ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ کے اختلاف کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ زنا سے حرمت کے احکام نہیں پیدا ہوتے، مثلاً باپ نے کسی عورت سے زنا کیا تو بیٹے

کا نکاح اس عورت سے ناجائز نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ ایک شخص نے اگر کسی عورت کے ساتھ زنا کیا اور اس سے لڑکی پیدا ہوئی تو خود وہ شخص اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے، ان کی دلیل ہے کہ زنا ایک حرام فعل ہے۔ اس لئے وہ حلال کو حرام نہیں کر سکتا امام ابوحنیفہ اس کے بالکل مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک مقاربت کے ذریعہ سے مرد عورت کے تعلقات پر جو فطری اثر پڑتا ہے وہ نکاح پر محدود نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ محرمات کی حرمت جس اصول پر مبنی ہے۔ اس کو نکاح کے ساتھ خصوصیت نہیں، اپنے نطفہ سے جو اولاد ہو گو زنا ہی سے ہو۔ اس کے ساتھ نکاح اور مقاربت کا جائز رکھنا بالکل اصول فطرت کے خلاف ہے۔ باپ کی موطوءہ کا بھی یہی حال ہے، وعلیٰ ہذا القیاس خود قرآن مجید میں اس کے اشارے موجود ہیں لیکن چونکہ یہاں نقلی بحث نہیں، ہم اس کا ذکر نہیں کرتے۔

معاملہ نکاح میں اختیار

دوسری بحث یہ ہے کہ معاملۂ نکاح کا مختار کون ہے یہ ایک نہایت مہتم بالشان سوال ہے۔ اور نکاح کے اثر کی خوبی یا برائی بہت کچھ اسی امر پر منحصر ہے۔ امام شافعیؒ و امام احمد حنبلؒ کے نزدیک عورت گو عاقلہ بالغہ ہو نکاح کے بارے میں خود مختار نہیں ہے۔ یعنی کسی حال میں وہ اپنا نکاح آپ نہیں کر سکتی، بلکہ ولی کی محتاج ہے۔ ان بزرگوں نے ایک طرف تو عورت کو اس قدر مجبور کیا، دوسری طرف ولی کو ایسے وسیع اختیارات دیئے کہ وہ زبردستی جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح باندھ دے، عورت کسی حال میں انکار نہیں کر سکتی، امام ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ عورت اپنے نکاح کی مختار ہے۔ بلکہ اگر نابالغی کی حالت میں ولی نے نکاح کر دیا تو بالغ ہو کر نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اس بحث پر امام شافعی کا مدار محض نقلی دلیلوں پر ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی امام ابوحنیفہؒ ان سے پیچھے نہیں۔ اگر امام شافعی کو لا نکاح الا بولی پر استدلال

ہے، تو امام صاحب کی طرف الثیب احق بنفسھا من ولیھا والبکر تستاذن فی نفسھا موجود ہے لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ معاملہ نکاح کا استحکام و بقا کس حد تک ضروری ہے، عقد نکاح کی خوبی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے، یعنی یہ کہ وہ تمدن کی بنیاد اور جماعتوں کا شیرازہ ہے۔ یہ اسی حالت میں ہے جب وہ ایک مضبوط اور دیرپا معاملہ قرار دیا جائے، ورنہ وہ صرف قضائے شہوت کا ایک ذریعہ ہے، امام ابوحنیفہ نے اس اصول کو نہایت قوت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے، انہوں نے طریقہ انعقاد، تعین مہر، ایقاع طلاق، نفاذ خلع کے جو قاعدے قرار دیئے ہیں، ان سب میں اصول سے کام لیا ہے۔

اس باب میں سب سے مقدم ان کا یہ مسئلہ ہے کہ الطلاق مع استقامۃ حال الزوجین حرام یعنی "جب تک زوجین کی حالت استقامت پر ہے طلاق دینا حرام ہے، ضرورت اور مجبوری کی حالت میں طلاق کو جائز قرار دیا ہے تو اس کا طریقہ ایسا رکھا ہے، جس سے اصلاح اور رجعت کی امید منقطع نہ ہو یعنی یہ کہ تین بار کر کے طلاق دے اور ہر طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ ہو تاکہ اس اثنا میں شوہر کو اپنے ارادے کے فیصل کے کے لئے کافی وقت ملے اگر وہ اس ارادے سے باز آنا چاہے تو باز آسکے، اور مستحب یہی ہے، کہ باز آئے۔ اس وسیع مدت میں بھی اگر اصلاح و آشتی کی توقع نہ ہو اور تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ فریقین کی برہمی کسی طرح اصلاح پذیر نہیں ہے، تو مجبوراً طلاق دے، طلاق کے بعد اس کو مہر ادا کرنا ہوگا۔ اور تین مہینہ تک زوجہ کی خورد و نوش کی کفالت کرنی ہوگی، اس سے یہ مقصد ہے کہ جب تک وہ دوسرا شوہر نہ پیدا کر سکے گذر اور بسر اوقات کے لئے اس کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور مہر کی رقم عام مصارف میں کام آئے، اس باب میں امام صاحب کے مسائل جو اور ائمہ سے مختلف ہیں، ہم ان کو ذیل میں یکجائی طور پر لکھتے ہیں، جس سے اندازہ ہو

سکے گا، کہ امام صاحب نے معاملہ نکاح کو کیسا مہتم بالشان اور مضبوط معاملہ سمجھا ہے اور ہر حالت میں اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) جب تک فریقین کی حالت میں استقامت ہو طلاق دینا حرام ہے۔	۱۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حرام نہیں۔
(۲) ایک بار تین طلاق دینا حرام ہے۔ اور اس کا مرتکب عاصی ہے۔	(۲) امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔
(۳) مہر کی تعداد کسی حالت میں دس درہم سے کم نہیں ہو سکتی، اس سے یہ مقصد ہے کہ مرد کو فسخ طلاق پر آسانی سے جرأت نہ ہو کیونکہ یہ تعداد غریب اور مفلس کے لئے ہے جس کو اس رقم کا ادا کرنا ایسا ہی مشکل ہے، جیسے امیروں کو دو چار ہزار کا ادا کرنا۔	(۳) امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے نزدیک ایک حبہ بھی مہر ہو سکتا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد بے دریغ بے سوچے سمجھے طلاق دینے پر جرأت کر سکتا ہے۔ اور عورت کو بوجہ اس کے کہ تفریق کے بعد محض مفلس اور نادار رہے گی۔ سخت تکالیف کا احتمال ہے۔
۴۔ خلوتِ صحیحہ سے پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔	۴۔ امام شافعی کے نزدیک نصف واجب ہوتا ہے۔
۵۔ جسمانی بیماریاں مثل برص وغیرہ فسخ نکاح کا سبب نہیں ہو سکتیں۔	۵۔ امام شافعیؒ و مالکؒ کے نزدیک ان کی وجہ سے فسخ نکاح ہو سکتا ہے۔
۶۔ اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اس کا انتقال ہو جائے، تو عورت کو میراث ملے گی۔	۶۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ملے گی۔

۷۔ طلاقِ رجعی کی حالت میں وطی حرام نہیں ہے۔ یعنی زوجیت کا تعلق ایسی معمولی بیزاری سے منقطع نہیں ہوتا۔	۷۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حرام ہے۔ گویا وہ بائنہ ہو چکی۔
۸۔ رجعت کے لئے اظہار زبانی کی ضرورت نہیں۔ ہر فعل جس سے رضامندی ظاہر ہو رجعت کے لئے کافی ہے مطلب یہ ہے کہ آسانی دی جائے۔ تاکہ رجعت بادنیٰ مصالحت ہو سکے۔	۸۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر اقرار و اظہار رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔
۹۔ رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ ورنہ بعض حالتوں میں گواہ نہ مل سکے اور رجعت کی مدت قریب الانقضاء ہے، تو طلاق بائن ہو جائے گی	۹۔ امام مالکؒ کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے۔

نکاح کے قواعد مرتب ہونے کے لئے یہ ایک نہایت ضروری امر ہے کہ فریقین کے حقوق نہایت فیاضی اور اعتدال کے ساتھ قائم کئے جائیں۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن باتوں میں مساوات حاصل ہے وہ باطل نہ ہونے پائے کیونکہ نکاح سے عورت کو اپنے امن و راحت کی توقع ہونی چاہئے نہ یہ کہ اس کے اصلی حقوق میں بھی زوال آئے۔ یہ اسلام کی خاص فیاضی ہے۔ جس کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں مل سکتی کہ اس نے معاملۂ نکاح میں عورتوں کے حقوق نہایت وسعت کے ساتھ قائم کئے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس اصول کو تمام مسائل میں محفوظ رکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ان مسائل میں جہاں اور ائمہ نے ان سے

اختلاف کیا ہے ، صریح غلطی کی ہے ۔ مثلاً خلع کا معاملہ جو طلاق سے مشابہ ہے ۔

دستوراتِ نکاح

اخیر بحث یہ ہے کہ نکاح کن دستورات کے ساتھ عمل میں آئے ؟ ان رسوم میں صرف دو مقصود پیشِ نظر ہیں ۔ اول یہ کہ فریقین کی رضامندی محقق ہو جائے ۔ دوسرے یہ کہ واقعۂ عقد کا اشتہار ہو جائے ان اغراض کے لحاظ سے امام ابو حنیفہؒ نے نہایت مناسب قاعدے قرار دیئے ہیں ۔ یعنی یہ کہ فریقین ایسے الفاظ استعمال کریں ، جن سے ظاہر ہو کہ انہوں نے معاملۂ نکاح کو قبول کر لیا ہے اور یہ کہ عقدِ نکاح دو گواہوں کے سامنے عمل میں آئے ۔ یہ دونوں سادہ اور آسان شرطیں ہیں ، جو ہر موقع پر استعمال کی جا سکتی ہیں ، لیکن بعض ائمہ نے بخلاف اس کے ان شرطوں میں ایسی سخت قیدیں لگائی ہیں ، جن کی پابندی نہایت مشکل ہے امام شافعی کا مذہب ہے ، کہ گواہانِ نکاح عادل ہونے چاہئیں ، ورنہ نکاح صحیح نہیں عدالت کے جو معنی مجتہدین اور خاص کر امام شافعی نے بیان کئے ہیں ، اس کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک آدھ عادل ہو سکتا ہے ۔ اس لئے اگر یہ قید ضروری سمجھی جائے تو صحیح نکاح کا وجود ڈھونڈے سے نہ مل سکے ۔ امام شافعی و امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ضرور ہے کہ گواہ مرد ہوں ، لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک عورتیں بھی گواہ ہو سکتی ہیں ، اور یہی قرینِ عقل بھی ہے ، امام شافعیؒ نے یہ بھی قید لگائی ہے ، کہ خاص تزویج کے الفاظ استعمال کیے جائیں ، حالانکہ خاص الفاظ کی پابندی کا کچھ حاصل نہیں جو الفاظ اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں ، مثلاً ہبہ تملیک وغیرہ سب عقدِ نکاح کے لیے کافی ہیں ۔

ذمیوں کے حقوق

ایک بڑی خصوصیت جو حنفی فقہ کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ذمیوں یعنی ان لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں ، لیکن مسلمانوں کی حکومت میں مطیعانہ رہتے ہیں ، نہایت فیاضی اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں اور

یہی خصوصیت ہے۔ جس کی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی، اگرچہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت خود شارع کی ہدایتوں میں جابجا موجود ہے۔ لیکن چونکہ وہ عام کلیات ہیں۔ اس کے علاوہ شارع کے بعض اقوال ظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعبیر مطالب میں اختلاف پیدا ہوئے ہیں، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ جو تعبیر امام ابوحنیفہؒ نے کی ہے وہی صحیح ہے، اسلام نہایت وسیع دنیا پہ حکمران رہا ہے اور اس کی حدودِ حکومت میں سینکڑوں غیر قومیں آباد تھیں اور ہیں، اس لیے اگر ان کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کی جائے تو ایک دن بھی امن قائم نہیں رہ سکتا امام ابوحنیفہ نے ذمیوں کو جو حقوق دیئے ہیں، دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی کسی غیر قوم کو نہیں دیئے، یورپ جس کو اپنے قانون اور انصاف پہ بڑا ناز ہے۔ بے شک زبانی دعوے کر سکتا ہے۔ لیکن عملی مثالیں نہیں پیش کر سکتا۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے یہ احکام اسلامی گورنمنٹوں میں عموماً نافذ تھے۔ اور خاص کر ہارون الرشید اعظم کی وسیع حکومت انہی احکام پر قائم تھی۔

سب سے بڑا مسئلہ قتل و قصاص کا ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کے برابر ہے یعنی اگر کوئی مسلمان ذمی کو عمداً قتل کر ڈالے تو مسلمان بھی اس کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے۔ تو جو خوں بہا مسلمانوں کے قتل بالخطا سے لازم آتا ہے، وہی ذمی کے قتل سے بھی لازم آئے گا۔

امام رازی نے اپنی کتاب مناقب الشافعی میں حنفیوں کو طعنہ دیا ہے۔ کہ ان کے نزدیک ابوبکر صدیقؓ کا خون اور ایک ذلیل ذمی کا خون برابر ہے۔ یعنی اگر ابوبکر صدیقؓ بے جرم کسی ذمی کو قتل کر ڈالتے تو حنفیوں کے نزدیک وہ بھی قتل کیے جانے کے مستحق تھے۔ حنفیوں نے اس مسئلہ کی تعمیم میں کہیں یہ مثال نہیں دی ہے۔ امام رازی نے اس غرض سے کہ وہ اس مسئلہ کو بدنما کر کے دکھائیں خود یہ مثال فرض کی

ہے، لیکن ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں، بے شبہ انصاف اور حق کی حکومت میں شاہ و گدا، مقبول و مردود کا ایک رتبہ ہے، بے شبہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے۔ کہ اس نے اپنی رعایا کو اپنے برابر سمجھا، اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے اور اگر امام رازی کو عار آتی ہے تو آئے۔

خود صحابہ کا کیا قول اور کیا عمل تھا، حضرت علی کا قول ہے۔ من کانت له ذمینا فدمه کدمنا ودیته کدیتنا۔ یعنی "ذمی کا خون ہمارا خون ہے اور اس کی دیت ہماری دیت ہے۔" حضرت علیؓ پر موقوف نہیں، تمام مہاجرین اور انصار کا یہی قول تھا اور اسی پر عمل درآمد تھا، عبید اللہ جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند تھے، انہوں نے حضرت عمرؓ کے زخمی ہونے کے وقت دو شخصوں کو جو کافر تھے اور جن پر ان کا شبہ تھا، قتل کر ڈالا، جب حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے مہاجرین و انصار کو بلایا اور اس بارے میں رائے پوچھی۔ تمام مہاجرین نے بالاتفاق کہا کہ عبید اللہ کو قتل کرنا چاہیئے۔

امام ابوحنیفہ نے ذمیوں کے لئے جو قواعد مقرر کیے وہ نہایت فیاضانہ قواعد ہیں وہ تجارت میں مسلمانوں کی طرح آزاد ہیں۔ ہر قسم کی تجارت کر سکتے ہیں اور ان سے اسی شرح سے ٹیکس لیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ جزیہ جو ان کی محافظت کا ٹیکس ہے۔ اس کی شرح حسب حیثیت قائم کی جائے گی۔ مفلس شخص جزیہ کا باقی دار ہو کر مر جائے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ ذمیوں کے معاملات انہی کی شریعت کے موافق فیصل کیے جائیں گے۔ یہاں تک کہ مثلاً اگر کسی مجوسی نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا، تو اسلامی گورنمنٹ اس نکاح کو اس کی شریعت کے موافق صحیح تسلیم کر لے گی، ذمیوں کی شہادت ان کے باہمی مقدمات میں مقبول ہو گی۔ ذمیوں کی اعزازی حالت یہ ہے کہ وہ حرم محترم میں جا سکتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتے ہیں۔ تمام مسجدوں میں بغیر اجازت حاصل کرنے کے داخل ہو سکتے ہیں، بجز

ان خاص شہروں کے جو مسلمانوں نے آباد کیے ہیں ہر جگہ وہ اپنی عبادت گاہ بنا سکتے ہیں۔ وہ اگر حربی کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیں۔ تو سپہ سالار ان پر اعتماد کر سکتا ہے۔ اور ان سے ہر طرح اعانت لے سکتا ہے۔

اس قسم کے اور احکام ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے عموماً تمام معاملات میں ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر قرار دیئے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ بعض امور میں تو انھوں نے اعتدال سے زیادہ فیاضی کی ہے۔ مثلاً اس امر میں کہ ذمی کس حالت میں عہد سے باہر ہو جاتا ہے۔ ان کا مذہب ہے۔ کہ بجز اس حالت کے کہ ان کے پاس جمعیت ہو اور وہ گورنمنٹ سے بمقابلہ پیش آئیں اور کسی صورت میں ان کے حقوق باطل نہیں ہوتے۔ مثلاً کوئی ذمی جزیہ ادا نہ کرے۔ یا مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو یا کافروں کی جاسوسی کرے۔ یا کسی مسلمان کو کفر کی ترغیب دے، یا خدا اور رسول کی شان میں بے ادبی کرے تو ان تمام حالتوں میں وہ سزا کا مستحق ہوگا لیکن باغی نہ سمجھا جائے گا۔ اور اس کے حقوق باطل نہ ہوں گے۔

اب اس کے مقابلہ میں اور ائمہ کے مسائل دیکھو امام شافعیؒ کے نزدیک کسی مسلمان نے گو بے جرم اور عمداً کسی ذمی کو قتل کیا ہو۔ تاہم وہ قصاص سے بری رہے گا صرف دیت دینی ہوگی، یا مالی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ وہ بھی مسلمانوں کی دیت کا ایک ثلث اور امام مالک کے نزدیک نصف۔ تجارت میں یہ سختی ہے کہ ذمی اگر تجارت کا مال ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جائے تو سال میں جتنی بار لے جائے ہر بار اس سے نیا ٹیکس لیا جائے گا۔

جزیہ کے متعلق امام شافعی کا مذہب ہے کہ کسی حال میں ایک اشرفی سے کم نہیں ہو سکتا، اور بوڑھے، اندھے، اپاہج، مفلس، تارک الدنیا تک اس سے معاف نہیں بلکہ امام شافعیؒ سے ایک اور روایت ہے کہ جو شخص مفلس ہونے کی وجہ سے جزیہ نہیں ادا

کرسکتا، وہ اسلام کی عملداری میں نہ رہنے پائے۔ جزیہ جوان پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس پر اضافہ ہو سکتا ہے۔ مگر کسی صورت میں کمی نہیں ہو سکتی، ذمیوں کی شہادت گو فریقین مقدمہ ذمی ہوں۔ کسی حال میں مقبول نہیں، اس مسئلہ میں امام مالک و امام شافعی دونوں متفق الرائے ہیں۔

ذمی کبھی حرم میں داخل نہیں ہو سکتا، اور نہ وہ مکہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت کے ساتھ داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن امام مالک اور امام حنبل کے نزدیک اس کو بالکل اجازت نہیں مل سکتی، ذمی اسلامی حدود و حکومت میں کہیں اپنی عبادت گاہ نہیں بنا سکتا۔

ذمیوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور وہ اسلامی فوج میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ذمی اگر کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو تو اسی وقت اس کے تمام حقوق باطل ہو جائیں گے اور وہ کافر حربی سمجھا جائے گا۔ یہ احکام بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ خاص ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک بت پرستوں کو جزیہ ادا کرنے پر بھی اسلامی حدود میں رہنے کی اجازت نہیں۔

یہ تمام احکام ایسے سخت ہیں۔ جن کا تحمل ایک ضعیف سے ضعیف محکوم قوم بھی نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے۔ کہ امام شافعی وغیرہ کا مذہب سلطنت کے ساتھ نہ نبھ سکا۔ مصر میں بے شبہ ایک مدت تک گورنمنٹ کا مذہب شافعیؒ تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عیسائی اور یہودی قومیں اکثر بغاوت کرتی رہیں۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں ذمیوں کے متعلق چند ایسے احکام بھی مذکور ہیں۔ جو نہایت سختی اور تنگ دلی پر مبنی ہیں، اور چونکہ وہ اس طریقہ سے ظاہر کیے گئے ہیں کہ گویا وہ خاص امام ابوحنیفہ کے مسائل ہیں اس لئے غیر قوموں کو مذہب حنفی پر بلکہ عموماً مذہب اسلام پر حملہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہدایہ میں

ہے کہ ذمیوں کو ضرور ہے کہ وہ وضع اور لباس میں مسلمانوں کی ہمسری نہ کریں، وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں ہتھیار نہ لگائیں، زنار پہنیں، ان کے گھروں پر علامت بنا دی جائے جس سے ظاہر ہو کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ وغیرہ وغیرہ صاحب ہدایہ نے ان احکام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ذمیوں کی تحقیر ضروری ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس سے بھی زیادہ سخت و بے رحمانہ احکام ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے متاخرین فقہا کی ایجاد ہے ورنہ امام ابوحنیفہ کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

فقہ حنفی کا نصوص شرعی کے موافق ہونا

۵۔ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں۔ اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے، ان میں امام ابوحنیفہ جو پہلو اختیار کرتے ہیں وہ عموماً نہایت قوی اور مدلل ہوتے ہے۔

نص کا لفظ قرآن، حدیث دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ احکام بھی نصی کہے جاتے ہیں۔ جو قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے ثابت ہیں۔ لیکن اس موقع پر ہم ان سے بحث نہیں کر سکتے۔ اور اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس قسم کے مسائل نہایت کثرت سے ہیں، جن کا مختصر سے مختصر حصہ بھی اس کتاب میں نہیں آ سکتا۔ اگر چند مسائل نمونہ کے طور پر بیان کیے جائیں تو بدگمانوں کو اس سوء ظن کا موقع باقی رہتا ہے کہ چند قوی مسائل لے لئے اور ضعیف چھوڑ دیئے، دوسری بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ آج ان مسائل کا فیصلہ مجتہدانہ نہیں ہو سکتا۔ حدیث کے متعلق بہت بڑی بحث صحت و عدم صحت کی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے۔ جس نے مسائل فقہ میں ائمہ کو مختلف الآراء کر دیا، ایک امام کے نزدیک ایک حدیث قابل حجت ہے اور دوسرے کے نزدیک نہیں، اس بحث کے تصفیہ کے لئے جو سامان ہمارے ملک میں موجود ہے۔ وہ بالکل ناکافی ہے، اور اس سے کسی حدیث کی نسبت مجتہدانہ

فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بڑا مرحلہ اسماء الرجال کا ہے۔ اس فن کی جو کتابیں ہمارے ملک میں موجود ہیں، مثلاً تہذیب الکمال مزی، تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال، طبقات الحفاظ، تہذیب الاسماء و اللغات وغیرہ ان میں جرح و تعدیل کے متعلق ائمہ کے جو اقوال مذکور ہیں اکثر ان کا سلسلہ سند مذکور نہیں، اس لئے محدثانہ حیثیت سے اس کے ثبوت و عدم ثبوت کا تصفیہ نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اکثر جروح مبہم ہیں اور جن جرحوں کو مفسر قرار دیا ہے۔ وہ بھی ابہام سے خالی نہیں، قدما نے اس فن میں جو تصنیفات لکھیں ان سے بلاشبہ یہ مباحث طے ہو سکتے ہیں، لیکن وہ یہاں میسر نہیں آئیں۔ علمائے حنفیہ نے خاص اس بحث پر کہ حنفی فقہ کے مسائل احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جس کو زیادہ شوق ہو ان تصنیفات کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

لیکن قرآن مجید میں اس بحث کا بڑا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن کے ثبوت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، اس لیے نزاع کا مدار صرف اس پر رہ جاتا ہے کہ جو مسئلہ اس سے مستنبط کیا گیا، صحیح طور پر کیا گیا یا نہیں۔ اس حالت میں بحث مختصر رہ جاتی ہے اور نہایت آسانی سے اس کا تصفیہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید سے جو احکام ثابت ہیں ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے، اور وہ فقہ کے مہمات مسائل ہیں اس لئے اگر یہ ثابت ہو کہ حنفی فقہ کے مسائل نصوص قرآن سے زیادہ مطابق ہیں۔ تو مہمات مسائل میں فقہ حنفی کی ترجیح بآسانی ثابت ہو جائے گی، اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ امام ابو حنیفہ کو حیثیت اجتہاد میں تمام ائمہ پر ترجیح ہے، کیونکہ اجتہاد کا مدار زیادہ تر استنباط اور استخراج ہی پر ہے۔

اس بدگمانی کی تردید کہ فقہ حنفی کے مسائل حدیث کے مخالف ہیں

ان وجوہ

کی بنا پر اگرچہ ہم صرف ان مسائل پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو قرآن سے ثابت ہیں۔ تاہم حدیث کے متعلق ایک اجمالی بحث ضرور ہے۔ جس سے بدگمانوں کو سوءِ ظن کا موقع نہ ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے مخالف ہیں۔ ان لوگوں میں سے بعض نے الزام دیا ہے۔ کہ امام صاحب نے دانستہ حدیث کی مخالفت کی بعض انصاف پسند وجہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ امام صاحب کے زمانہ تک احادیث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے بہت سی حدیثیں ان کو نہیں پہنچیں لیکن یہ خیال محض لغو اور بے سروپا ہے۔ امام صاحب کے زمانہ تک تو حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں، لیکن جب جمع ہو چکیں، اس وقت بڑے بڑے محدثین ان کے مسائل کو کیوں صحیح تسلیم کرتے رہے، وکیع بن الجراح جن کی روایتیں صحیح بخاری میں بکثرت موجود ہیں اور جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کہا کرتے تھے، کہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو حافظ العلم نہیں دیکھا۔ وہ امام ابو حنیفہ کے مسائل کی تقلید کرتے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان کے حال میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی۔

یحییٰ بن سعید بن القطان جو فن جرح و تعدیل کے موجد ہیں۔ اکثر مسائل میں امام ابو حنیفہ کے پیرو تھے۔ خود ان کا قول ہے قد اخذنا باکثر اقوالہ[۲] امام طحاوی جو حافظ الحدیث تھے، اور مجتہد فی المذہب کا درجہ رکھتے تھے۔ پہلے شافعی تھے، پھر امام ابو حنیفہ کے مسائل اختیار کئے اور کہا کرتے تھے۔ کہ میں ابو حنیفہ کا مقلد نہیں ہوں بلکہ مجھ کو ان سے توارد ہے طحاوی، امام بخاری اور مسلم کے ہم زمان ہیں، اور یہ وہ زمانہ ہے۔ جب حدیث کا دفتر کامل طور سے مرتب ہو گیا تھا۔ متاخرین میں علامہ ماردینی حافظ زیلعی، ابن الہمام قاسم بن قطلوبغا وغیرہم کی نسبت تنگ نظر کا کون گمان کر سکتا ہے یہ لوگ عموماً حنفی مسائل کے حامی ہیں۔

---

[۱] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ترجمہ وکیع بن الجراح [۲] التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابو حنیفہ

اس کے علاوہ جو لوگ عموماً حافظ الحدیث تسلیم کئے گئے ہیں، ان کے مسائل امام ابوحنیفہؒ سے کیوں موافق ہیں۔ طبقہ اولیٰ میں سب سے بڑے محدث امام احمد بن حنبل ہیں۔ جن کی شاگردی پر امام بخاری و مسلم کو ناز تھا اور جن کی نسبت محدثین کا عام قول ہے کہ "جس حدیث کو احمد بن حنبل نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔ امام احمد بن حنبل بہت سے مسائل میں۔ امام شافعی کے مخالف اور امام ابوحنیفہ رحؒ کے موافق ہیں۔ خوارزمی نے لکھا ہے کہ "فروع وجزئیات چھوڑ کر امہات فقہ کے متعلق ایک سو چھبیس مسئلوں میں ان کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ اتفاق ہے۔ اور امام شافعی سے اختلاف" ہم نے خود بہت سے مسائل میں تطبیق کی ہے، جس سے خوارزمی کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے، سفیان ثوری کو محدثین نے امام المحدیث تسلیم کیا ہے۔ ان کے مسائل امام ابوحنیفہ کے مسائل کے موافق ہیں، قاضی ابو یوسف کہا کرتے تھے کہ واللہ سفیان اکثر متابعة منی لابی حنیفہ یعنی خدا کی قسم سفیان مجھ سے زیادہ ابوحنیفہؒ کی پیروی کرتے ہیں"۔ صحیح ترمذی میں سفیان ثوری کے مسائل مذکور ہیں، جو زیادہ تر شافعیؒ کے مخالف اور ابوحنیفہؒ کے موافق ہیں۔

ایک تیمم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں

امام ابوحنیفہ رحؒ کا مذہب ہے، کہ ایک تیمم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں۔ امام مالکؒ و امام شافعی کی رائے ہے کہ ہر فرض کے لئے نیا تیمم کرنا چاہیے امام صاحب کا استدلال ہے، کہ جو حیثیت وضو کے حکم کی ہے وہی تیمم کی ہے۔ اور جب ہر نماز کے لئے وضو کی ضرورت نہیں تو تیمم کی بھی تجدید کی ضرورت نہیں البتہ جن لوگوں کا مذہب ہے، کہ ایک وضو سے کئی نمازیں ادا نہیں ہو سکتیں وہ تیمم کی نسبت بھی یہ حکم لگا سکتے ہیں، لیکن وضو اور تیمم میں تفریق کرنی جیسا امام شافعی وغیرہ نے کی محض بے وجہ ہے

لہ اس قول کو حافظ ابوالمحاسن نے قلائد العقیان میں نقل کیا ہے

تیمم کرنے والے کا اثنائے نماز میں پانی پر قادر ہونا

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ اثنائے نماز میں تیمم کرنے والے کو اگر پانی مل جائے تو تیمم جاتا رہے گا۔ امام مالک و احمد بن حنبل اس کے مخالف ہیں، امام صاحب کا استدلال یہ ہے۔ کہ قرآن میں تیمم کا جواز اس قید کے ساتھ مشروط ہے کہ لَمْ تَجِدُوْا مَاءً" یعنی جب پانی نہ ملے" صورت مذکورہ میں جب شرط باقی نہیں رہی تو مشروط بھی باقی نہیں رہا۔

باب الجنایات

جنایات کے باب میں جو احکام قرآن مجید میں وارد ہیں ان کی تعبیر جس صحت کے ساتھ امام ابوحنیفہ نے کی کسی دوسرے مجتہد نے نہیں کی، زمانہ جاہلیت میں قصاص کے جو قاعدے رائج تھے نہایت ناانصافی اور جہالت پر مبنی تھے۔ اسلام نے نہایت خوبی سے اس کی اصلاح کی اور ایسے احکام مقرر کیے جن سے بڑھ کر نہ کبھی ہوئے نہ ہو سکتے ہیں۔

جاہلیت میں قصاص کا اعتبار مقتول و قاتل کی حیثیت سے کیا جاتا تھا، جو معزز قبیلے تھے وہ دوسرے قبیلوں سے اس طرح قصاص لیتے تھے۔ کہ اپنے غلام کے بدلے دوسرے قبیلے کے آزاد کو اپنی عورت کے بدلے ان کے مرد کو اور اپنے مرد کے بدلے دوسرے قبیلے کے دو مردوں کو قتل کرتے تھے۔ خدا نے قصاص کا عام حکم صادر فرمایا جس کا یہ مطلب ہے کہ:-

قصاص کا حکم کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ قاتل ہر حالت میں مقتول کے بدلے مارا جائے گا۔ خواہ شریف ہو یا رذیل، مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد، مسلم ہو یا ذمی، زیادہ توضیح کے لئے ان صورتوں کی خاص طور پر بھی نفی کی جو عرب میں اسلام سے پہلے جاری تھیں۔

چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي
الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى

تم پر مقتول کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا۔ آزاد کے بدلے آزاد غلام کے بدلے غلام۔ عورت عورت کے بدلے

زمانۂ جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ قتل عمد کے بدلے میں مالی معاوضہ دے دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کو دیت کہتے تھے۔ اسلام نے اس کو باطل کیا اور دیت کو جو ایک قسم کا جرمانہ ہے۔ صرف شبہ عمد اور قتل خطا کی حالت میں جائز رکھا۔ اور اس کی مقدار مسلمان و ذمی کے لئے یکساں مقرر کی۔ چنانچہ خدا نے ارشاد فرمایا:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ
مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا
خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ
مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا
فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ
كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ
وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔

اور مسلمان کی شان نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے قتل کرے، تو اس کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اور مقتول کے اہل کو دیت دینی ہوگی۔ مگر یہ کہ معاف کر دیں پھر اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جو تم مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اور وہ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا ہوگا۔ اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان میثاق ہے، تو مقتول کے اہل کو دیت دینی ہوگی۔ اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔

نساء ۱۳

یہ احکام نہایت صاف اور صریح طور پر قرآن سے ثابت ہوتے ہیں۔ اور امام

ابوحنیفہؒ انہی احکام کے قائل ہیں، لیکن امام شافعی وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے جس کی نسبت ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یقیناً ان کی غلطی ہے۔

پہلا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ و امام احمد بن حنبلؒ قائل ہیں کہ "غلام کے بدلے آزاد قتل نہیں کیا جا سکتا۔ غلام اور آزاد میں ایسا بے رحمانہ تفرقہ کرنا ہرگز قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگر الحرُّ بالحرِّ کی تخصیص سے استدلال ہے۔ تو الانثیٰ بالانثیٰ کی تخصیص سے لازم آتا ہے کہ عورت کے بدلے مرد نہ قتل کیا جائے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

دوسرا اختلاف یہ ہے۔ کہ امام شافعی ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے کم قرار دیتے ہیں، حالانکہ دیت کے جو الفاظ خدا نے مومن کے حق میں استعمال کئے وہی ان لوگوں کے حق میں بھی ارشاد کئے، جو مسلمانوں سے میثاق و معاہدہ رکھتے ہیں۔ بے شبہ یہ اسلام کی نہایت فیاض دلی ہے۔ کہ اس نے مسلمان و ذمی کا حق برابر رکھا، لیکن افسوس ہے کہ ایسے فیاضانہ حکم کی لوگوں نے غلط تاویل کی۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی قتل عمد کی حالت میں بھی مالی معاوضہ ادا کرنا کافی سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں قتل عمد کی حالت میں قصاص کا حکم ہے۔ دیت کی کہیں اجازت نہیں، اور یہی اقتضائے عقل ہے، جاہلیت میں قتل، مقدمات دیوانی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس وجہ سے مالی معاوضہ اس کا بدل ہو سکتا تھا، لیکن اسلام ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

چوتھا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی کیفیتِ قتل میں مساوات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ یعنی اگر قاتل نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا ہو تو وہ بھی پتھر سے سر توڑ کر مارا جائے یا کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو وہ بھی آگ سے جلا کر مارا جائے، لیکن اس قسم کی مساوات پر قرآن کا کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا۔

پانچواں اختلاف یہ ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قتلِ عمد کی حالت میں کفارہ لازم نہیں آتا، امام شافعی قصاص و کفارہ دونوں لازمی قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن مجید میں کفارہ کا حکم قتل خطا کے ساتھ مخصوص ہے۔ قتل عمد میں کفارہ کا کچھ ذکر نہیں۔

وراثت

وراثت کے بعض احکام میں جو نہایت مہتم بالشان ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں اختلاف ہے، ان مسائل میں امام ابوحنیفہ نے جو پہلو اختیار کیا وہ نہایت صریح طور سے قرآن سے ثابت ہے، وراثت کے قاعدے جو اسلام نے مقرر کیے ہیں وہ تمام دنیا کے قواعد وراثت سے الگ ہیں۔ اور ایسے دقیق اور نازک اصول پر مبنی ہیں۔ جو علانیہ اس بات کی دلیل ہیں۔ کہ خدا کے سوا اور کوئی ان احکام کا واضع نہیں ہو سکتا وراثت کا اصلی اصول یہ ہے۔ کہ متوفی اگر اپنی جائداد کسی خاص شخص کو دے جاتا تو اسی کو ملتی لیکن جب اس نے کوئی ہدایت نہیں کی تو اس پر لحاظ ہو گا کہ اس کے فطری تعلقات کن کن لوگوں کے ساتھ کس کس تفاوت کے ساتھ تھے، جو لوگ یہ تعلقات رکھتے ہیں۔ وہ اسی تفاوت درجات کے ساتھ اس کی جائداد کے مالک ہوں گے، گویا متوفی کی یہ معنوی ہدایت ہے کہ لوگوں کو اسی مناسبت سے دیا جائے۔ جس نسبت سے میرے تعلقات ان کے ساتھ تھے دوسرا اصول جو پولیٹیکل اکانومی کا عام اصول ہے یہ کہ دولت کا بہت سے اشخاص میں تقسیم اس سے اچھا ہے۔ کہ وہ ایک شخص تک محدود رہے یہ عمدہ اصول تمام اور قوموں کی نگاہ سے رہ گئے اور اس وجہ سے ان کا قانون وراثت بھی ناتمام اور محدود رہ گیا، عیسائیوں کے قانون میں بڑے بیٹے کو جائداد پہنچتی ہے۔ دوسرے بھائیوں کو کچھ دست برداشتہ ملتا ہے، ہندوؤں کے ہاں صرف اولاد ذکور جائداد کی مالک ہے باپ بھائی وغیرہ محروم مطلق ہیں، لیکن اسلام نے نہایت وقت نظر سے ان تعلقات پر نگاہ کی جو ورثہ کے ساتھ ہیں اور اسی نسبت سے تین درجے قرار دیے ہیں، ذوی الفروض، عصبات، ذوالارحام ان تینوں درجوں کی تصریح قرآن مجید میں موجود ہے اور خاص کر ذوالارحام کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ
الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ

امام ابوحنیفہؒ نے توریث کے احکام میں یہ تینوں مراتب قائم رکھے لیکن امام شافعی و امام مالک نے ذوالارحام کو سرے سے خارج کر دیا، چنانچہ ان کے نزدیک نانا بھتیجا بھانجے وغیرہ کسی حال میں ورثہ نہیں پا سکتے، ان بزرگوں نے ذوی الارحام عام سمجھا ہے، اور ذوی الفروض وعصبات اس کے افراد قرار دیے ہیں، جیسا کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے، لیکن یہ ایک صریح غلطی ہے۔

امام صاحب کے شاگردان رشید

امام صاحب کے بے شمار شاگردوں میں سے ہم ان چالیس شخصوں کا مختصر تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں۔ جو امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ میں شریک تھے۔ لیکن۔ افسوس ہے کہ ہم ان میں سے صرف چند شخصوں، کا نام معلوم کر سکے۔ یعنی

۱۔ قاضی ابو یوسف

۲۔ زفر

۳۔ اسد بن عمر

۴۔ عافیتہ الازدی

۵۔ داؤد الطلائی

۶۔ قاسم بن معن

۷۔ علی بن مسہر

۸۔ یحیی بن زکریا

۹۔ حبان

۱۰۔ مندل

۱۱۔ امام محمد

چنانچہ ان لوگوں کے مختصر حالات ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ان شاگردوں کا ذکر بھی ضرور ہے۔ جو حدیث و رجال کے فن میں امام وقت تھے۔ چنانچہ ہم انہی سے شروع کرتے ہیں۔

امام صاحب کے وہ شاگرد جو محدّث وقت تھے

یحییٰ بن سعید القطان

فن رجال کا سلسلہ ان ہی سے شروع ہوا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ کہ فن رجال میں اوّل جس شخص نے لکھا۔ وہ یحییٰ بن سعید القطان ہیں، پھر ان کے بعد ان کے شاگردوں میں یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، عمرو بن علی، الفلاس، ابوخیثمہ نے اس فن میں گفتگو کی اور ان کے بعد شاگردوں یعنی امام بخاری و مسلم وغیرہ نے۔

حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا، کہ جب حلقہ درس میں بیٹھتے تو امام احمد بن حنبل، علی ابن المدینی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو کر ان سے حدیث کی تحقیق کرتے اور نماز عصر سے جو ان کے درس کا وقت تھا مغرب تک برابر کھڑے رہتے[1]، راویوں کی تحقیق و تنقید میں یہ کمال پیدا کیا تھا، کہ ائمہ حدیث عموماً کہا کرتے تھے کہ یحییٰ جس کو چھوڑ دیں گے، ہم بھی اس کو چھوڑ دیں گے[2]۔ امام احمد بن حنبل[3] کا مشہور قول ہے کہ مارایت بعینی مثل یحییٰ بن سعید القطان یعنی "میں نے اپنی آنکھوں سے یحییٰ کا مثل نہیں دیکھا"، اس فضل و کمال کے ساتھ امام ابوحنیفہ کے حلقہ درس میں اکثر شریک ہوتے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے، اس زمانہ تک تقلید معین کا رواج نہیں ہوا تھا، تاہم اکثر مسائل میں وہ امام صاحب ہی کی تقلید کرتے تھے، خود ان کا قول ہے۔ قد اخذنا باکثر اقوالہ[4] یعنی "ہم نے امام ابوحنیفہ کے اکثر اقوال اخذ کئے" علامہ ذہبی نے

---

[1] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ یحییٰ بن القطان [2] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی

[3] خلاصہ تہذیب الکمال ترجمہ عبداللہ بن المبارک۔

[4] فتح المغیث و جواہر مضیۂ۔

تذکرۃ الحفاظ میں جہاں وکیع بن الجراح کا ذکر کیا ہے لکھا ہے۔ "یفتی بقول ابی حنیفۃ و کان یحییٰ القطان یفتی بقولہ ایضا" یعنی وکیع امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

سنہ ١٢٠ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ١٩٨ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی۔

عبداللہ بن المبارک

محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں ان کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے، "وہ امام جس کی امامت و جلالت پر ہر باب میں عموماً اجماع کیا گیا ہے، جس کے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے، جس کی محبت سے مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے"۔

حدیث میں جو ان کا پایہ تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ محدثین ان کو "امیر المومنین فی الحدیث" کے لقب سے پکارتے تھے، ایک موقع پر ان کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ان سے خطاب کیا کہ "یا عالم المشرق" امام سفیان ثوری جو مشہور محدث ہیں اس موقع پر موجود تھے بولے کہ "کیا غضب ہے، عالم مشرق کہتے ہو وہ عالم المشرق والمغرب ہے"، امام احمد حنبل کا قول ہے کہ عبداللہ بن المبارک کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کسی نے حدیث کی تحصیل میں کوشش نہیں کی"۔ خود عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ "میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث سیکھی جن میں سے ہزار سے روایت کی"۔ صحیح بخاری و مسلم میں ان کی روایت سے سینکڑوں حدیثیں مروی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فن روایت کے بڑے ارکان میں سے ہیں۔ حدیث و فقہ میں ان کی بہت سی تصنیفات ہیں، لیکن افسوس کہ آج ان کا پتہ نہیں۔

ان کے فضل و کمال اور زہد و تقوے نے اس قدر لوگوں کو مسخر کر لیا تھا کہ بڑے بڑے اُمرا اور سلاطین کو وہ رتبہ حاصل نہ تھا، ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید رقہ گیا اسی

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی۔

[2] خلاصہ تہذیب الکمال

زمانہ میں عبد اللہ بن المبارک بھی رقہ پہنچے ان کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سے لوگ دوڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہزاروں آدمی ساتھ ہوئے اور ہر طرف گرد چھا گئی۔ ہارون رشید کی ایک حرم نے جو برج کے غرفہ سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، حیرت زدہ ہو کر پوچھا یہ کیا حال ہے۔ لوگوں نے بتایا خراسان کا عالم آیا ہے جس کا نام عبد اللہ بن المبارک ہے"۔ بولی کہ حقیقت میں سلطنت اس کا نام ہے ہارون الرشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں[۱] ہو سکتا"۔

یہ امام ابوحنیفہؒ کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں اور امام صاحب کے ساتھ ان کو خاص خلوص تھا۔ ان کو اعتراف تھا کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوری کے فیض سے حاصل ہوا، ان کا مشہور قول ہے کہ لولا ان اللہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفۃ و سفیان کنت کسائر الناس یعنی" اگر اللہ تعالے نے ابوحنیفہؒ و سفیان ثوری کے ذریعہ سے میری دستگیری نہ کی ہوتی تو میں ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا" امام ابوحنیفہؒ کی شان میں ان کے اشعار اکثر منقول ہیں خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں چند اشعار نقل کیے ہیں۔ جن میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

رأیت اباحنیف حین تولی   ویطلب علمہ بحرا عزیزا

مرو کے رہنے والے تھے، ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں مقام ہیت میں وفات پائی۔

یحییٰ بن زکریا بن ابی مائدہ

مشہور محدث تھے۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صرف ان لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جو حافظ الحدیث کہلاتے تھے، چنانچہ یحییٰ کو بھی انہی لوگوں میں داخل کیا ہے، اور ان کے طبقہ میں سب سے

---

[۱] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبد اللہ بن المبارک

[۲] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابوحنیفہؒ۔

پہلے انہی کا نام لکھا ہے ۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے مشہور اُستاد ہیں ۔ کہا کرتے تھے ۔ کہ یحییٰ کے زمانہ میں یحییٰ پر علم کا خاتمہ ہو گیا"[1] صحاح ستہ میں ان کی روایت سے بہت سی حدیثیں ہیں، وہ محدث اور فقیہ دونوں تھے ۔ اور ان دونوں فنوں میں بہت بڑا کمال رکھتے تھے ۔ چنانچہ علاّمہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے ۔ احد الفقہاء الکبار والمحدثین الاثبات ۔

یہ امام ابوحنیفہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مدت تک ان کے ساتھ رہے تھے ۔ یہاں تک کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابوحنیفہؒ" کا لقب دیا ہے ۔ یہ تدوین فقہ میں امام صاحب کے شریک اعظم تھے، امام طحاوی نے لکھا ہے کہ وہ تیس برس تک شریک رہے ۔" اگرچہ یہ مدت صحیح نہیں ہے، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ بہت دنوں تک امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ کا کام کرتے رہے اور خاص کر تصنیف و تحریر کی خدمت انہی سے متعلق تھی[2] میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا قول ہے ۔ کہ کوفہ میں اول جس شخص نے تصنیف کی وہ یحییٰ ہیں" معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تحریر کا کام یحییٰ سے متعلق تھا، اس لئے لوگوں نے انہی کو مستقل مصنف سمجھ لیا ۔

مدائن میں منصبِ قضا پر ممتاز تھے اور وہاں سنہ ۱۸۳ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی ۔

وکیع بن الجراح

فن حدیث کے ارکان میں شمار کیے جاتے ہیں، امام احمد بن حنبل کو ان کی شاگردی پر فخر تھا، چنانچہ جب وہ ان کی روایت سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے، تو ان لفظوں سے شروع کرتے تھے" یہ حدیث مجھ سے اس شخص نے روایت کی کہ تیری آنکھوں نے ان کا مثل نہ دیکھا ہوگا" یحییٰ بن معین جو فن

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی ترجمہ وکیع بن جراح ۔

[2] تہذیب الاسماء واللغات ۔

رجال کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں ان کا قول تھا، کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کو وکیع پر ترجیح دوں[1]" اکثر ائمہ حدیث نے ان کی شان میں اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ بخاری و مسلم میں اکثر ان کی روایت سے حدیثیں مذکور ہیں، فن حدیث و رجال کے متعلق ان کی روائتیں نہایت مستند خیال کی جاتی ہیں۔

یہ امام ابوحنیفہ رح کے شاگرد خاص تھے اور ان سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں، اکثر مسائل میں امام صاحب کی تقلید کرتے تھے اور انہی کے قول کے موافق فتویٰ دیتے تھے خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی حنیفہ وکان قد سمع منہ شیئا کثیرا۔ علامہ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں اس کی تصدیق کی ہے۔

سنہ ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔

داؤد الطائی

خدا نے عجیب حسن قبول دیا تھا۔ صوفیہ ان کو بڑا مرشد کامل مانتے ہیں، تذکرۃ الاولیاء میں ان کے مقامات عالیہ مذکور ہیں، فقہا اور خصوصاً فقہائے حنفیہ ان کے تفقہ اور اجتہاد کے قائل ہیں۔ محدثین کا قول ہے کہ ثقۃ بلا دنزاع[3] اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ان تمام القاب کے مستحق تھے، محارب بن دثار جو مشہور محدث تھے کہا کرتے تھے کہ داؤد اگر اگلے زمانہ میں ہوتے تو خدا قرآن مجید میں ان کا قصہ بیان کرتا۔[4]

ابتداء میں فقہ و حدیث کی تحصیل کی، پھر علم کلام میں کمال پیدا کیا اور بحث و مناظرہ میں مشغول ہوئے، ایک دن کسی موقع پر ایک شخص سے گفتگو کرتے کرتے اس پر کنکری پھینک ماری اس نے کہا " داؤد تمہاری زبان اور ہاتھ دونوں دراز ہو چلے"۔ ان پر عجیب اثر ہوا، بحث و مناظرہ بالکل چھوڑ دیا تاہم تحصیل علم کا مشغلہ جاری تھا، برس دن کے بعد کل کتابیں دریا میں ڈبو دیں، اور تمام چیزوں سے قطع تعلق کر لیا، امام محمد کا بیان ہے، کہ میں داؤد سے

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نودی ترجمہ وکیع بن جراح۔ [2] تہذیب الاسماء و اللغات

[3] میزان الاعتدال ذہبی [4] تاریخ ابن خلکان۔

اکثر مسئلے پوچھنے جاتا، اگر کوئی ضروری اور عملی مسئلہ ہوتا تو بتا دیتے ورنہ کہتے کہ " بھائی مجھے اور ضروری کام ہیں۔

یہ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں۔ خطیب بغدادی، ابن خلکان، علامہ ذہبی اور دیگر مورخین نے جہاں ان کے حالات لکھے ہیں۔ امام صاحب کی شاگردی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے، تدوین فقہ میں بھی امام صاحب کے شریک تھے اور اس مجلس کے معزز ممبر تھے۔

سنہ ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔

ان بزرگوں کے سوا اور بھی بہت سے نامور محدثین ہیں، مثلاً فضل بن دکیع، حمزہ ابن حبیب الزیات، ابراہیم بن طہمان سعید بن اوس، عمرو بن میمون، افضل ابن موسیٰ وغیرہ امام صاحب کے تلامذہ میں داخل ہیں، لیکن ہم نے صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو تلامذۂ خاص کہے جا سکتے ہیں۔ اور جو مدتوں امام صاحب کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔

امام صاحب کے شاگردوں میں جو فقہ کے امام بنے

قاضی ابو یوسف

ان کی منزلت اور عظمت وشان اس قابل تھی کہ ان کا مستقل تذکرہ لکھا جاتا اور جب ہی ان کے علمی کمالات کا اندازہ بھی ہوسکتا تھا، لیکن یہ فرصت کے کام ہیں، خدا کسی کو توفیق دے تو یہ کام پورا ہوسکتا ہے۔ اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے میرا اسی قدر فرض ہے، کہ ان کی مختصر تاریخ لکھ دوں، جس سے ان کی لائف اور علمی کمالات پر ایک اجمالی رائے قائم ہوسکے۔

نسب اور ولادت

ان کا نسب انصار سے ملتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سعد بن رضؓ حبتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے، ان کے باپ ایک غریب آدمی تھے، اور مزدوری محنت کرکے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ۱۱۳ھ یا ۱۱۷ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے، ان کو اگرچہ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا، لیکن باپ کی مرضی نہ تھی، وہ چاہتے تھے کہ کوئی پیشہ سیکھیں اور گھر میں چار پیسے کما کر لائیں۔ تاہم جب قاضی صاحب موقع اور فرصت پاتے علماء کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن امام ابوحنیفہؒ کے حلقہ درس میں حاضر تھے کہ باپ پہنچے، اور وہاں سے زبردستی اٹھا لائے، گھر پر آکر سمجھایا کہ "بیٹا" ابوحنیفہ کو خدا نے رزق کی طرف سے اطمینان دیا ہے۔ تم ان کی ریس کیوں کرتے ہو"۔ قاضی صاحب نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے۔ امام ابوحنیفہ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ "یعقوب اب نہیں آتے"، ان کو امام صاحب کی جستجو کا حال معلوم ہوا تو حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بیان کی، امام صاحب نے

چپکے سے ایک تھیلی حوالہ کی، گھر پر آ کر دیکھا تو اس میں سو درہم تھے۔ امام صاحب نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب خرچ ہو چکے تو مجھ سے کہنا۔ اس طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے، یہاں تک کہ قاضی صاحب نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا، اور اُستادِ وقت بن گئے۔

قاضی صاحب نے امام ابو حنیفہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ وقت کی خدمت میں علم کی تحصیل کی، اعمش، ہشام بن عروہ سلیمان تیمی، ابو اسحٰق شیبانی، یحییٰ بن سعید الانصاری وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں، محمد بن اسحٰق سے مغازی و سیر پڑھی۔ محمد بن ابی لیلےٰ سے مسائل سیکھے۔ خدا نے ذہن و حافظہ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں ان تمام علوم کی تحصیل کرتے تھے، حافظ ابن عبد البر نے جو ایک مشہور محدث ہیں لکھا ہے کہ "ابو یوسف محدثین کے پاس حاضر ہوتے اور ایک جلسہ میں پچاس ساٹھ حدیثیں سن کر یاد کر لیتے"۔

امام صاحب جب تک زندہ رہے، قاضی صاحب ان کے حلقہ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد دربار سے تعلق پیدا کرنا چاہا، چنانچہ خلیفہ مہدی عباسی نے سنہ ۱۶۶ھ میں ان کو قاضی کی خدمت دی۔ مہدی کے بعد اس کے جانشین ہادی نے بھی ان کو اسی عہدہ پر بحال رکھا، لیکن ہارون الرشید نے اُن کی لیاقتوں سے واقف ہو کر تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور یہ وہ عہدہ تھا جو اس وقت تک اسلام کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا، بلکہ زمانہ مابعد میں بھی بجز قاضی احمد بن ابی داؤد کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ قاضی صاحب نے سر رشتہ قضا میں جو ترقیاں کیں ان کی تفصیل خود ان کی لائف میں لکھی جائے تو لکھی جا سکتی ہے۔

جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچویں تاریخ سنہ ۱۸۲ھ میں وفات پائی، محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ مرتے وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے۔ اے خدا تو

جانتا ہے۔ کہ میں نے کوئی فیصلہ عمداً خلاف واقع نہیں کیا، میری ہمیشہ کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو تیری کتاب اور تیرے پیغمبرؐ کے طریقہ کے موافق ہو۔ جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تھا تو میں امام ابو حنیفہ کو واسطہ بناتا تھا۔ اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، ابو حنیفہؒ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے اور عمداً حق کے راستہ سے باہر نہ جاتے تھے۔ قاضی صاحب بہت بڑے دولت مند تھے، لیکن دولت کا استعمال اچھی طرح کیا، مرتے وقت وصیت کی چار لاکھ روپیہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بغداد کے محتاجوں کو دیئے جائیں۔

قاضی صاحب متعدد علوم میں کمال رکھتے تھے، اگرچہ ان کی شہرت زیادہ تر ترتیب فقہ میں ہوئی، لیکن اور علوم میں بھی وہ اپنے آپ ہی نظیر تھے، مورخ ابن خلکان نے ہلال ابن یحییٰ کا قول نقل کیا ہے کہ ابو یوسف تفسیر، مغازی، ایام العرب کے حافظ تھے اور فقہ ان کا ادنیٰ سا علم تھا"۔ حدیث میں ان کا یہ پایا تھا کہ حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ اہل الرائے میں ابو یوسف سے بڑھ کر کوئی شخص کثیر الحدیث نہیں"۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ کان منصفا فی الحدیث" مزنی جو امام شافعی کے مشہور شاگرد ہیں، کہا کرتے تھے۔ ابو یوسف اتبع القوم للحدیث[1] خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے۔ کہ اول جب مجھ کو علم حدیث کا شوق پیدا ہوا تو ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یحییٰ بن معین و امام احمد بن حنبل اور بہت سے ائمہ حدیث نے قاضی صاحب سے حدیثیں روایت کیں، اس سے زیادہ عظمت و شان کی کیا دلیل ہو گی۔[2]

فقہ میں جو ان کا پایہ ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے، امام ابو حنیفہ کو خود ان

---

[1] یہ اقوال علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیے ہیں۔

[2] قاضی صاحب کی نسبت کتب رجال میں جرحیں بھی منقول ہیں، مگر وہ عموماً ناقابلِ اعتبار ہیں، کیونکہ یا تو وہ مبہم جرحیں ہیں یا ان کا منشا اجتہادی مسائل کا اختلاف ہے۔

کے کمال کا اعتراف تھا، ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے، امام صاحب عیادت کو گئے، واپس آئے تو ساتھیوں سے کہا کہ اگر خدانخواستہ یہ شخص ہلاک ہوا تو دنیا کا عالم ہلاک ہوا۔" اور ائمہ بھی ان کے جدتِ ذہن اور قوت فہم کے معترف تھے، امام اعمش اس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے۔ انہوں نے قاضی صاحب سے ایک مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب بتایا، امام اعمش نے کہا" کہ اس پر کوئی سند بھی ہے"۔ قاضی صاحب نے فرمایا" ہاں وہ حدیث جو فلاں موقع پر آپ نے مجھ سے بیان کی تھی"۔ امام اعمش نے کہا کہ" یعقوب یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، جب تمہارے والد کا عقد بھی نہیں ہوا تھا، لیکن اس کا صحیح مطلب آج ہی سمجھ میں آیا۔[1]

قاضی صاحب پہلے شخص ہیں جس نے فقہ حنفی میں تصنیفیں کیں، مختلف علوم میں ان کی تصنیفات بہت ہیں، اور ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی مفصل فہرست بھی نقل کی ہے۔ لیکن ہماری نگاہ سے صرف کتاب الخراج گذری ہے اس لئے ہم اس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہارون الرشید نے خراج وجزیہ وغیرہ کے متعلق قاضی صاحب سے یادداشتیں طلب کی تھیں، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں چند تحریریں بھیجیں، یہ کتاب انہی تحریروں کا مجموعہ ہے، اگرچہ اس میں بہت سے مضامین ہیں۔ لیکن زیادہ تر خراج کے مسائل ہیں۔ اور اس لئے اس کو اس زمانہ کا قانون مالگذاری کہہ سکتے ہیں، اس کتاب میں زمین کے اقسام حیثیت اور تنوع، لگان کی مختلف شرحیں، کاشتکاروں کی حیثیتوں کا اختلاف، پیداوار کی قسمیں، اس قسم کی اور مراتب کو اس خوبی سے اور دقت نظر کے ساتھ منضبط کیا ہے اور ان کے متعلق قواعد قرار دیئے ہیں کہ اس زمانہ کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے۔ طرزِ تحریر میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نہایت آزادانہ ہے۔ قواعد اور ہدایتوں کے ساتھ جابجا ان ابتریوں کا ذکر ہے، جو

---

[1] ابن خلکان ترجمہ قاضی ابو یوسف

انتظاماتِ سلطنت میں موجود تھیں۔ اور ان پر نہایت بے باکی کے ساتھ خلیفۂ وقت کو متوجہ کیا ہے۔

قاضی صاحب کی تاریخ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہارون الرشید جیسے جبار اور خود پرست بادشاہ کے دربار میں وہ اپنے فرائض اس جرأت اور آزادی سے ادا کرتے تھے۔ جس کی مثال ایشیائی سلطنتوں میں بہت کم مل سکتی ہے۔ کتاب الخراج میں ایک جگہ وہ ہارون الرشید کو لکھتے ہیں کہ "۔ اے امیر المومنین۔ اگر تو اپنی رعایا کے انصاف کے لئے" مہینہ میں ایک بار بھی دربار کرتا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ تیرا دشمن ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعیت سے پردہ کرتے ہیں۔ اور اگر تو دو ایک دربار بھی کرتا تو یہ خبر تمام اطراف میں پھیل جاتی اور ظالم اپنے ظلم سے باز آتے بلکہ اگر عُمّال و صوبہ داروں کو یہ خبر پہنچے کہ تو برس میں ایک دفعہ انصاف کے لئے بیٹھتا ہے تو ظالموں کو کبھی ظلم پر جرأت نہ ہونے پائے"۔

قاضی صاحب کے سوا کس کی جرأت تھی کہ ہارون الرشید کو یہ الفاظ لکھتا۔

امام محمد یہ فقہ حنفی کے دوسرے بازو ہیں۔ ان کا اصلی وطن دمشق کے متصل ایک گاؤں تھا۔ جس کو حرستا کہتے ہیں۔ ان کے والد وطن چھوڑ کر واسط چلے آئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ امام محمد ۱۳۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔

سن رشد کا آغاز تھا کہ کوفہ جانا ہوا، یہاں علوم کی تحصیل شروع کی اور بڑے بڑے محدثین و فقہا کی صحبت اُٹھائی، مسعر بن کدام، امام سفیان ثوری، مالک بن دینار امام اوزاعی وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں۔ کم و بیش دو برس تک امام ابوحنیفہ کی خدمت میں رہے امام صاحب کی وفات کے بعد قاضی ابویوسف سے بقیہ تحصیل کی، پھر مدینہ گئے۔ اور تین سال تک امام مالک سے حدیث پڑھتے رہے آغاز شباب ہی میں ان کے

فضل وکمال کے چرچے پھیل گئے تھے۔ بیس برس کے سن میں مسندِ درس پر بیٹھے اور لوگوں نے ان سے استفادہ شروع کیا۔ ہارون رشید نے ان کے فضل وکمال سے واقف ہوکر قضا کی خدمت دی اور اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۸۹ھ میں رے گیا تو ان کو بھی ساتھ لے گیا۔ رَے کے قریب رنبویہ ایک گاؤں ہے۔ وہاں پہنچکر قضا کی اتفاق یہ کہ کسائی جو مشہور نحوی گذرا ہے، وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا۔ اور اس نے بھی یہیں انتقال کیا۔ ہارون الرشید کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور کہا آج فقہ اور نحو دونوں کو ہم دفن کر آئے"۔ علامہ یزیدی نے جو ایک مشہور ادیب اور ہارون الرشید کے درباریوں میں تھے، نہایت جانگداز مرثیہ لکھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

فقلت اذا ما اشکل الخطب من لنا
بایضاحہ یوما وانت فقید!

ہم نے کہا کہ جب تو نہ رہا تو ہمارے لئے مشکلات کو حل کرنے والا کہاں سے آئے گا۔

امام محمد نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ دربار ہی کے تعلق سے بسر کیا لیکن آزادی اور حق گوئی کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ۱۷۵ھ میں یحییٰ علوی نے جب علم بغاوت بلند کیا تو ہارون رشید ان کا سروسامان دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ اور دب کر صلح اختیار کی۔ معاہدہ قلمبند ہوا۔ اور یحییٰ کے اطمینان کے لئے بڑے بڑے علماء، فضلا، فقہا اور محدثین نے اس پر دستخط کیے۔ یحییٰ صلح پر راضی ہوکر بغداد میں آئے تو چند روز کے بعد ہارون الرشید نے نقضِ عہد کرنا چاہا۔ تمام علماء نے ہارون الرشید کے خوف سے فتویٰ دے دیا کہ صورتِ موجودہ میں نقضِ عہد جائز ہے۔ لیکن امام محمد نے علانیہ مخالفت کی اور اخیر تک اپنے اصرار پر قائم رہے۔

امام محمد جس رتبہ کے شخص تھے، اس کا اندازہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہو

سکتا ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ "امام محمد جب کوئی مسئلہ بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی اُتر رہی ہے۔ انہی کا قول ہے کہ "میں نے امام محمد سے ایک بار شتر کے برابر علم حاصل کیا"۔ امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ "دقیق مسائل آپ کو کہاں سے حاصل ہوئے؟ فرمایا محمد بن الحسن کی کتابوں سے۔

امام محمد کے حلقہ درس سے اگرچہ بہت سے علماء تعلیم پا کر نکلے، لیکن ان سب میں امام شافعی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس سے تعجب ہوگا۔ اگلے زمانہ میں بھی ابن تیمیہ نے امام شافعی کی شاگردی سے انکار کیا تھا، لیکن حق کو کون دبا سکتا ہے۔ تاریخ و رجال کی آج سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، وہ کیا شہادت دے رہی ہیں۔ بے شبہ امام شافعی کو امام محمد کے فیض صحبت نے بڑے بڑے کمالات کے رستے دکھائے اور اس کا خود ان کو اعتراف تھا۔ حافظ ابن حجر امام شافعی کا قول نقل کرتے ہیں۔ کان محمد بن الحسن جید المنزلۃ عند الخلیفہ۔ فاختلفت الیہ وقلت ھو اولی من جھۃ الفقہ فلزمتہ وکتبت عنہ[2] یعنی محمد بن الحسن خلیفہ کے ہاں بہت معزز تھے۔ اس لئے میں ان کے پاس آتا جاتا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ وہ فقہ کے لحاظ سے بھی عالی رتبہ ہیں، اس لئے میں نے ان کی صحبت لازم پکڑی۔ اور ان کا درس قلمبند کرتا تھا"۔

امام محمد خود بھی امام شافعی کی نہایت عزت کرتے تھے اور شاگردوں کی نسبت ان کے ساتھ خاص مراعات کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک دن ہارون الرشید کے دربار میں جا رہے تھے۔ راہ میں امام شافعی ملے جو ان کی ملاقات کو آ رہے تھے۔ اسی وقت گھوڑے سے اُتر پڑے اور نوکر سے کہا کہ خلیفہ کے پاس جا اور عذر بیان کر کر

---

[1] یہ تمام اقوال محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں نقل کئے ہیں

[2] دیکھو توالی التاسیس مطبوعہ مصر صفحہ ٦٩

میں اس وقت حاضر نہیں ہو سکتا۔" امام شافعی نے کہا "میں اور کسی وقت حاضر ہوں گا۔ آپ دربار تشریف لے جائیں"۔ امام محمد نے کہا "نہیں وہاں جانا کچھ ضرور نہیں"۔ امام محمد و امام شافعی میں اکثر مناظرات بھی رہتے تھے۔ اور اسی بنا پر بعضوں کو ان کی شاگردی سے انکار ہے۔ لیکن اس زمانہ کی استادی و شاگردی میں یہ امر معیوب نہ تھے اور دراصل آج بھی معیوب نہیں۔

امام محمد کی شہرت زیادہ تر فقہ میں ہے۔ اور ان کی تصنیفات عموماً اسی فن کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ تفسیر، حدیث اور ادب میں بھی اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔

امام شافعی کا قول ہے۔ کہ میں نے قرآن مجید کا عالم امام محمد سے بڑھ کر نہیں دیکھا[1]"۔ ادب و عربیت میں اگرچہ ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں لیکن فقہ کے، جو مسائل نحو کی جزئیات پر مبنی ہیں، اکثر جامع کبیر میں مذکور ہیں۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس فن میں ان کا کیا پایہ تھا، چنانچہ ابن خلکان وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

حدیث میں ان کی کتاب مؤطا مشہور ہے۔ اس کے علاوہ کتاب الحج جو امام مالک کے رد میں لکھی ہے۔ اس میں اکثر حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور متعدد مسائل میں جوش ادعا کے ساتھ کہا ہے۔ کہ مدینہ والوں کو دعویٰ ہے۔ کہ وہ حدیث کے پیرو ہیں، حالانکہ ان مسائل میں صریح ان کے خلاف حدیث موجود ہے"۔

امام محمد کی تصنیفات تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور آج فقہ حنفی کا مدار ان ہی کتابوں پر ہے۔ ہم ذیل میں ان کتابوں کی فہرست لکھتے ہیں۔ جن میں امام ابو حنیفہ رح کے مسائل روایتہً مذکور ہیں اور اس لیے وہ فقہ حنفی کے اصل خیال کیے جاتے ہیں۔

---

[1] توالی التاسیس صفحہ ٦٩

مبسوط ۔ اصل میں یہ کتاب قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے۔ ان ہی مسائل کو امام محمد نے زیادہ توضیح اور خوبی سے لکھا، یہ امام محمد کی پہلی تصنیف ہے۔

جامع صغیر مبسوط کے بعد تصنیف ہوئی، اس کتاب میں امام محمد نے قاضی ابو یوسف کی روایت سے امام ابو حنیفہؒ کے تمام اقوال لکھے ہیں۔ کل ۵۳۲ مسئلے ہیں جن میں سے ایک سو ستر ۱۷۰ مسئلوں کے متعلق اختلاف رائے بھی لکھا ہے۔ اس کتاب میں تین قسم کے مسائل ہیں۔

۱۔ جن کا ذکر بجز اس کتاب کے اور کہیں نہیں پایا جاتا۔

۲۔ اور کتابوں میں بھی مذکور ہیں، لیکن ان کتابوں میں امام محمد نے تصریح نہیں کی تھی کہ یہ خیال ابو حنیفہ کے مسائل ہیں، اس کتاب میں تصریح کر دی ہے۔

۳۔ اور کتابوں میں مذکور تھے، لیکن اس کتاب میں جن الفاظ سے لکھا ہے اس سے بعض نئے فائدے مستنبط ہوتے ہیں، اس کتاب کی تیس چالیس شرحیں لکھی گئیں، جن کے نام اور مختصر حالات کشف الظنون وغیرہ میں ملتے ہیں۔

جامع کبیر، جامع صغیر کے بعد لکھی گئی، ضخیم کتاب ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہ کے اقوال کے ساتھ قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے اقوال بھی لکھے ہیں، ہر مسئلہ کے ساتھ دلیل بھی لکھی ہے۔ متاخرین حنفیہ نے اصول فقہ کے جو مسائل قائم کئے ہیں۔ زیادہ تر اسی کتاب کے طرز استدلال اور طریق استنباط سے کئے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہا نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں سے ۲۴ شرحوں کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

زیادات ۔ جامع کبیر کی تصنیف کے بعد جو فروع یاد آئے وہ اس میں درج کیے اور اسی لیے زیادات نام رکھا۔

کتاب الحج ۔ امام محمد امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ گئے اور تین برس وہاں رہ کر امام مالک سے موطا پڑھی، اہل مدینہ کا طریقہ جدا تھا۔ بہت سے مسائل میں وہ لوگ امام ابو حنیفہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام محمد نے مدینہ سے آکر یہ کتاب لکھی، اس میں اول

وہ ابو حنیفہؒ کا قول نقل کرتے ہیں، پھر مدینہ والوں کا اختلاف بیان کر کے حدیث، اثر
قیاس سے ثابت کرتے ہیں، کہ ابو حنیفہ کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط۔ امام رازی
نے مناقب الشافعی میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب چھپ گئی ہے، اور ہر جگہ ملتی
ہے، میں نے اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے۔

سیر صغیر و کبیر :۔ یہ سب سے اخیر تصنیف ہے، اول سیر صغیر لکھی، اس
نسخہ امام اوزاعی کی نظر سے گذرا انھوں نے طعن سے کہا کہ اہل عراق کو فن
نسبت"۔ امام محمد نے سُنا تو سیر لکھنا شروع کی، تیار ہو چکی تو ساٹھ جزوں
اس ضخیم کتاب کو ایک خچر پر رکھوا کر ہارون الرشید کے پاس لے گئے،
پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس نے قدر دانی کے لحاظ سے شہزادوں کو
محمد سے اس کی سند لیں۔

ان کتابوں کے علاوہ امام محمد کی اور تصانیف بھی فقہ
جرجانیات، رقیات، ہارونیات۔ لیکن یہ کتابیں فقہا کی ا
داخل نہیں، بلکہ کتاب الحج جس کا ذکر اوپر ہو چکا وہ بھ

سنہ ۹ھ

سنہ ۱۷۹ھ

امام زفر فقہ میں اگرچہ ان کا رتبہ امام مح
کی کوئی تصنیف موجود نہیں
معلوم ہوتی، اس لیے صاحبین سے ان کو
یہ عربی النسل تھے، شروع زما
جیسا کہ علامہ نووی نے تہذیب اللغ
تھے، پھر فقہ کی طرف توجہ کی اور
یحییٰ بن معین جو فن
الرائی ثقہ مامون

امام م

کمال تھا، امام ابو حنیفہ ان کی نسبت فرمایا

ذکر اوپر گذر چکا، ان سے استفادہ

جم

ابو یوسف کی

ہیں سے ایک شخص کا ایک

قسم کے مسائل ہیں، سے کیا

ار جن کا ذکر بجز ہے آئی امام محمد

الرشید

۲۔ اور کتابوں میں ہارون الرشید امام

کی تھی کہ یہ خیال ابو حنیفہ کے جی میں آیا کہ خود کتاب امام

۳۔ اور کتابوں میں مذکور ہیں، مثلاً کیسانیات

بعض نئے فائدے مستنبط ہوتے ہیں جو موجود ہیں الروایۃ ہیں

کے نام اور مختصر حالات کشف الظنون مصطلاح میں ظاہر خارج ہے۔

جامع کبیر۔ جامع صغیر کے بعد لکھی اس سلسلہ سے لیکن چونکہ ان

ے اقوال کے ساتھ قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے اقوال زیادہ مانا جاتا ہے حالات بھی بہت کم

متاخرین حنفیہ نے اصول فقہ کے جو مسائل قائم کئے ہیں، زیادہ تر ہے۔ اور ان کے

سے گئے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہا نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں بہ خود رکھتا تھا۔ کا شغل رہا اور اسی وجہ سے

زیادات۔ جامع کبیر کی تصنیف کے بعد جو فروع ہیں یا ان کو حدیث صاحب الحدیث کہلاتے

کیے اور اسی لیے زیادات نام رکھا۔ ات میں تصریح کی ہے

کتاب الحج۔ امام محمد امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد مدینہ عمر تک یہی مشغلہ رہا۔

وہاں رہ کر امام مالک سے موطا پڑھی، اہل مدینہ کا طریقہ جدا تھا۔ بہت جرح و تعدیل کے امام ہیں ان کا قول ہے کہ ذو

امام ابو حنیفہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام محمد نے مدینہ سے آکر یہ کتاب بعض بزرگوں نے ان کی تصنیف بھی بتائی لیکن

امام مالک

ولادت سنہ ۹۳ھ

وفات سنہ ۱۷۹ھ

خصوصیات

- مدینۃ الرسولؐ کے سب سے بڑے محدث، عالم اور فقیہ تھے۔
- زہد میں یکتا، حبِ رسولؐ میں فرد، سنتِ نبوی پر عمل کرنے میں بے مثال تھے۔
- موطا امام مالک" اہل علم کے حلقہ میں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ مانی جاتی ہے۔
- کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، مدینہ میں ان کی درسگاہ علوم نبوی کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔
- جلال علم کا یہ عالم تھا، کہ خلیفۂ وقت بھی حلقۂ درس میں ایک معمولی شخص کی طرح شریک ہوا۔
- طلاق جبری کے خلاف فتویٰ دیا، جس سے نتیجۃً بیعتِ جبری کی مخالفت بھی نکلتی تھی، حکومت مخالف ہو گئی، گرفتار ہوئے، تشہیر کی گئی، کوڑے لگے مگر کوڑے کی ہر ضرب پر جب تک زبان چلتی رہی یہی کہتے رہے ہیں، مالک بن انس فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری حرام ہے"!
- مالکی مذہب، ساحلی مقامات اور اندلس میں خوب پھلا پھولا۔

•

ولادت، طفولیّت، خاندان

مالک نام، عبد اللہ کنیت، امام دار الہجرۃ لقب، باپ کا نام انس تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے، مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو ابن حارث ذی اصبح[1]۔

امام مالک ایک خالص عرب خاندان سے تھے، جو جاہلیت و اسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اسلام کے بعد مدینۃ النبی میں سکونت اختیار کی، امام یمن کے اخیر خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ "اصبح" سے تعلق رکھتے تھے، امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے۔ اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے وہ مشہور ہیں۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابو عامر عہد نبوی میں مشرف باسلام ہوئے، غالباً اس شرف اندوزی کی تاریخ نہایت قدیم ہے، یعنی سنہ ۲ھ۔

امام مالک کا سالِ ولادت

امام کی ولادت کا سنہ مختلف فیہ ہے مورخ یافعی نے طبقات الفقہا میں سنہ ۹۴ھ لکھا ہے، ابن خلکان نے سنہ ۹۵ھ بتایا ہے، لیکن صحیح تاریخ ولادت سنہ ۹۳ھ ہے جیسا کہ محدث ذہبی نے تذکرہ میں تصریح کی ہے۔ اور سمعانی نے انساب میں اس کو اختیار کیا ہے۔

اس وقت بنی اُمیّہ کی حکومت کا اوج شباب تھا۔ ولید بن عبد الملک جو اموی

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی طبع فوتو غرافی یورپ لفظ "اصبحی"۔

مروانی حکومت کا تیسرا تاجدار تھا۔ سریر آرائے خلافتِ دمشق تھا۔ فتوحاتِ اسلامیہ کا سیلاب مشرق میں ترکستان، کابل اور سندھ کو عبور کر چکا تھا۔ اور مغرب میں افریقہ اور اسپین کی سرزمینوں میں موجیں لے رہا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس عہد میں امام پیدا ہوئے۔ اس کا تاجدار جس سرزمین کو تلوار سے فتح کر رہا تھا۔ امام کے قلم نے سب سے زیادہ وہیں قبضہ حاصل کیا۔ یعنی طرابلس۔ ٹیونس۔ الجزائر۔ مراکش اور اسپین میں۔

تعلیم، تربیت، تفقہ، تکمیل حدیث

امام نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کے آغوش میں پایا خود گھر اور گھر سے باہر تمام شہر علماء فضلا کا مخزن تھا۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے، لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے، تمام اکابر صحابہ جو علوم شریعت کے امین اور قرآن و سنت کے خزینہ دار تھے اسی شہر اقدس میں سکونت پذیر تھے، عہدِ نبوی ؐ کے بعد بھی ۲۴، ۲۵ برس تک حکومتِ اسلامیہ کا یہ مرکز تھا۔ یہیں سے احکام و فتاوی فقہائے صحابہ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دُنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔

مدینہ کے فقہائے صحابہ

حضرت ابوبکر رض صدیق، عمر فاروق رض اور حضرت عائشہ رض جو اسرار شریعت کے راز داں تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رض جن سے بڑھ کر آنحضرت صلعم کے اعمال و سنن کا متبع اور واقف کار کوئی دوسرا نہ تھا، حضرت ابن عباس رض جو حبر الامۃ تھے، حضرت ابوہریرہ رض جن سے بڑھ کر حدیث کا کوئی دوسرا راوی نہیں، حضرت زید رض بن ثابت جو کاتبِ وحی تھے، ان سب کی درسگاہیں اسی شہر میں آباد تھیں، جن سے ہزاروں اشخاص وحی و سنت کے علوم کے وارث بن کر نکلے۔

صحابہ کے تلامذہ

بیتِ صدیق کی وارث ان کی صاحبزادی عائشہ صدیقہ رض کے تلامذہ کبار، ان کے بھتیجے قاسم بن محمد بن ابی بکر، اُن کے بھانجے عروہ بن زبیر رض تھے۔ مسندِ فاروق رض کے جانشین عبداللہ بن عباس رض اور عبداللہ

بن عمرؓ تھے، حضرت ابنِ عمرؓ کے شاگردان باخلاص نافع اور عبد اللہ بن دینار، ان کے دو غلام اور سالم بن عبد اللہ ان کے فرزند رشید تھے، حضرت زید بن ثابت نے اپنی وراثت اپنے گھر میں چھوڑی، یعنی ان کے بیٹے خارجہ بن زید اس کے مالک ہوئے، ابو ہریرہؓ نے اپنی امانت اپنے داماد سعید بن مسیبؒ کے سپرد کی، حبر الامۃ (عبد اللہ) بن عباس نے گو اپنی دولت زیادہ تر مدینہ کے باہر مکہ، کوفہ اور بصرہ میں لٹائی، لیکن جو مدینہ میں رہی وہ سعید بن مسیب کے حصہ میں آئی۔

تلامذۂ صحابہ جن کو اصطلاح میں تابعین کہتے ہیں، تمام ملک میں پھیلے تھے۔ لیکن ہم کو صرف مدینہ سے بحث ہے، ان میں سے ممتاز و مشہور لوگوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں چند اور ممتاز مشاہیر تھے، مثلاً ہشام بن عروہ محمد بن منکدر، عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود، محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، عامر بن عبد اللہ جعفر صادق، ربیعہ رائی، ابو سہیل نافع بن مالک، سلیمان بن یسار وغیرہ یہ وہ بزرگانِ اسلام ہیں، جن کے فضل و کمال کے آغوش میں اسلام کے علم دین نے نشو و نما پائی ہے۔

فقہائے سبعہ ان میں ابو بکر بن حارث (سنہ ۹۴ھ) خارجہ بن زید (سنہ ۹۹ھ) قاسم بن محمد (سنہ ۱۰۱ھ سعید بن مسیب) (سنہ ۱۰۱ھ) عبید اللہ بن عتبہ (سنہ ۱۰۲ھ)، سالم بن عبد اللہ سنہ ۱۰۶ھ، سلیمان بن یسار (سنہ ۱۰۱ھ)، مدینہ کے فقہائے سبعہ کہلاتے ہیں، صحابہ کے بعد تمام فتاوے، مسائل اور مقدمات و قضایا انہی کے فیصلے سے طے پاتے تھے، ان کی مجلسِ اجتماعی یعنی جہاں یہ ساتوں مل کر بیٹھتے تھے، اس عہد کی سب سے بڑی عدالت العالیہ تھی۔ فقہ مدینہ جس کا ذکر آگے آئے گا، انہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج بحث ہیں۔

شیوخ مالک امام صاحب نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ و بہار تھا، باستثنائے

چند یہ تمام بزرگوار درس و افتاء میں مشغول تھے۔ امام نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا۔ اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا، وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا۔ اور اس لئے امام دارالہجرت آپ کا لقب ہوا۔ امام کے شیوخ کی یوں تعداد تو بہت ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں ہے کہ روی عن خلق کثیر یعنی انہوں نے بہت سے لوگوں سے روائتیں کی ہیں، لیکن موطا میں جن شیوخ سے انہوں نے روایت کی ہے، چند کے علاوہ کُل کے کُل مدینہ کے باشندے ہیں اس سے اور نیز اس واقعہ سے کہ امام کا طلب علم کے لئے دوسرے شہروں کا سفر ثابت نہیں، یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ نے طلب علم کے لئے کبھی مدینہ سے باہر قدم نہیں نکالا اور اس کا سبب ظاہر ہے۔ کہ جس کا گھر اور وطن خود زر و جواہر کی کان ہو۔ اس کو باہر دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حاجت کیا ہے؟ دوسری بات یہ ہے، کہ مدینہ خود مرکز تھا، تمام ملک کے اساتذہ اور شیوخ خود یہاں کھنچ کھنچ کے چلے آتے تھے، سال میں ایک دفعہ (حج کے موقع پر) مدینہ کی زیارت کا شوق لوگوں کو کشاں کشاں لے آتا تھا۔

امام کے شیوخ واعزہ

گھر میں امام کے دادا، چچا اور والد خود محدث تھے امام نے طلب حدیث کی تو اپنے گھر کو ان علوم کا مرجع پایا، امام کے دادا جو ثقات رواۃ میں ہیں امام صاحب کے ہوش تک زندہ تھے، امام کی عمر دس برس کی تھی، جب انہوں نے وفات پائی، لیکن شاید اپنے بچپن یا دادا کے بڑھاپے کی وجہ سے کہ محدثین اور عوام دونوں کے نزدیک یہ دونوں زمانے برابر ہیں۔ اس فیض سے بلاواسطہ آپ نے تمتع حاصل نہیں کیا۔ ابو سہیل نافع امام کے ایک چچا روایت و حدیث کے شیخ تھے۔ امام زہری وغیرہ کے استاد ہیں۔ امام نے بھی ان سے حدیثیں سیکھی ہیں، ان کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع

دونوں اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، لیکن ان سے کوئی روایت امام نے موطا میں نہیں نقل کی ہے۔

امام نے قرآن مجید کی قرأت وسند مدینہ کے امام القرار ابو درہم نافع بن عبد الرحمٰن المتوفی سنہ ۱۶۹ھ سے حاصل کی۔ جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی بنیاد ہے۔ نافع بن عبد الرحمٰن سے اخذ قرأت کی روایت خود امام صاحب کی زبانی منقول ہے۔ لیکن زمانہ نہیں مذکور۔ اس بنا پر کہ قرآن مجید کی تعلیم ہمیشہ مسلمانوں میں لڑکپن میں ہوتی ہے۔ عجب نہیں کہ اس کا یہی زمانہ ہو۔

علم الحدیث

علم حدیث کی تعلیم بھی بچپن ہی سے شروع ہوئی جیسا کہ گذشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ اور نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت نافع ہیں۔ یا ممکن ہے کہ آپ کے چچا ابو سہیل ہوں کہ وہ خود گھر کے اندر تھے۔ لیکن یہ قیاس ہے، کوئی اس کی تصریح نہیں۔

نافع

حضرت عبداللہ بن عمر کے جن کی جلالتِ شان ظاہر ہے، آزاد کردہ غلام تھے۔ اسلام کی روایات میں غلام کا وہ مفہوم نہیں جو یورپ کی ڈکشنری میں تم کو نظر آتا ہے۔ یورپ میں غلام مظلومیت، بیکسی، ذلت، خواری اور جہالت کا مجموعہ ہے۔ لیکن اسلام میں عزت، احسان، وفا، تربیت، علم اور جانشینی آقا کو کہتے ہیں حضرت ابن عباسؓ کا غلام عکرمہ وہ ہے۔ جس پر علم تفسیر کا مدار ہے اور یہ حضرت ابن عمرؓ کے غلام نافع ہیں۔ جو حدیث وروایت کے استاد وشیخ تھے۔

نافع نے کامل ۳۰ برس حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ اور متعدد صحابہ حضرت عائشہؓ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابوسعید خدریؓ وغیرہم سے روایت کی ہے۔ امام اوزاعی، امام زہری، ایوب سختیانی، ابن جریج، امام مالک جیسے ائمۃ الحدیث ان سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔ نافع کی جلالتِ قدر

کا اس سے اندازہ ہو گا کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جو خود ایک مجتہد و ناقدِ فن تھے۔ نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا، ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی۔

نافع جب تک زندہ رہے امام مالک ان کے حلقۂ درس میں موجود رہے مجلس میں پہنچ کر ان سے پوچھتے تھے کہ اُن مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے"، نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے[1] شاگرد کو استاد کے علم و فضل پر اتنا غرور تھا کہ فرماتے ہیں، "جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پروا نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں" شاگرد و استاد کے شرف و قبول کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمر کو دنیا سلسلۃ الذہب یعنی "طلائی زنجیر" کہہ کر پکارتی ہے،

نافع کے علاوہ امام نے مدینہ کے دیگر شیوخ کبار سے بھی حدیث سیکھی، جن میں ممتاز لوگ یہ ہیں، محمد بن شہاب الزہری، جعفر صادق بن محمد، محمد بن منکدر، محمد بن یحییٰ الانصاری، ابو حازم، یحییٰ بن سعد۔

محمد بن شہاب الزہری

ان کا نام اصل میں محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہری القرشی ہے۔ لیکن مشہور صرف ابن شہاب زہری کے نام سے ہیں، صحابہ کے بعد تابعین میں جو لوگ روایت و حدیث کے اساطین ہیں۔ ان میں امام زہری کا رتبہ حضرت سعید بن مسیب کے سوا سب سے بلند ہے، صحاح ستہ جو اسلام کا کارنامۂ فخر ہے، ابن شہاب زہری کی روایات سے مالا مال ہے، ابوبکر بن حزم کے بعد علم حدیث کے یہ دوسرے مدوّن ہیں صحابہ کرام میں سے حضرت انسؓ و جابر و ابن عمر و سہل بن سعد وغیرہم متعدد صحابہ کے دیدار کا اور ان سے روایت کا ان کو شرف حاصل تھا، فقہائے سبعہ

---

[1] طبقات ابن سعد جزء تابعین مدینہ ترجمہ مالک

اور دیگر شیوخ مدینہ کے سینوں میں جو علم منتشر و پراگندہ تھا۔ امام زہری کے بعد امام مالک کے سینہ میں منتقل ہوا، امام مالک کے زبانی مروی ہے کہ ابن شہاب زہری جب مدینہ آتے تو ہم طلبائے علم کا ان کے دروازے پہ اژدحام ہو جاتا امام زہری نے مدینہ چھوڑ کر شام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن امام مالک کو یہ بُعد گوارا نہ تھا۔ ایک بار شاگرد نے استاد سے شکایت کی کہ مدینہ میں رہ کر آپ نے طلبِ علم کی اور جب کامل ہو گئے تو مدینہ چھوڑ کر ادام (واقع شام) جا کر آپ بس گئے"۔ استاد نے جواب دیا۔ "مدینہ کے آدمی جب آدمی تھے تو میں مدینہ میں رہا اور جب بدل گئے، تو میں بھی نکل گیا"۔[۱]

امام لیث مصری اعتراف کرتے تھے کہ زہری سے بڑھ کر جامع علم کوئی دوسرا نہیں" خود امام زہری کا بیان ہے کہ جو چیز میں نے اپنے دل کو سپرد کی وہ کبھی گم نہ ہوئی"۔ ناقدین حدیث کہتے ہیں۔ کہ امام زہری سے بڑھ کر متن و سند کا کوئی حافظ نہ تھا۔ امام مالک کے علاوہ امام لیث مصری، امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، عطا بن ابی رباح (شیخ زہری) عمرو بن دینار، سفیان بن عیینہ، ابن جریج اور اس طبقہ کے عام محدثین امام زہری کے شاگرد تھے، لیکن ان میں سب سے زیادہ جس نے ان کے نام کو روشن کیا وہ امام مالک تھے۔ حضرت احمد بن حنبل سے زیادہ رجال کا ناقد اور کون ہو سکتا ہے۔ ایک دن ان سے ان کے بیٹے نے پوچھا کہ زہری کے شاگردوں میں سب سے زیادہ وثوق کے قابل کون ہے"۔ تو امام احمد بن حنبل نے جواب دیا کہ مالک سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس زمانہ کی انصاف پسندی دیکھو کہ امام زہری نے باایں ہمہ علم و فضل خود اپنے شاگرد (مالک) سے بھی استفادہ میں عار نہیں کیا ہے اور بعض شیوخ میں استاد و شاگرد دونوں مشترک ہیں امام زہری

---

[۱] جامع بیان العلم ابن عبدالبر صفحہ ۳۲۴

نے ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

جعفر صادق

جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب معروف بہ امام جعفر نے اپنے پدر بزرگوار امام محمد باقر اور عروہ بن زبیر، عطا ر اور محمد بن منکدر سے روایتِ حدیث کی امام ابو حنیفہ امام مالک، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، شعبہ ابو عاصم، یحییٰ انصاری آپ کے تلامذہ ہیں، ابو حاتم جو ناقدین رجال میں ہیں فرماتے ہیں کہ "امام جعفر صادق جیسے بزرگوں کی نسبت یہ پوچھنا کہ وہ کیسے تھے ان کی کسر شان ہے"۔ ابن حبان کا قول ہے "امام سادات اہل بیت، عباد تبع تابعین اور علمائے مدینہ میں سے تھے"۔ یحییٰ بن معین نے ان کو "موثوق و مامون" کہا ہے، امام موصوف کبھی کبھی اپنے شاگردوں کا امتحان بھی لیا کرتے تھے، ایک بار ابو حنیفہ سے سے پوچھا کہ اگر بحالتِ احرام کوئی ہرن کے رباعیہ (چار اگلے بڑے دانت) توڑ دے تو کیا لازم آئے گا۔ امام ابو حنیفہ نے عرض کیا کہ۔ اے فرزند رسول اللہؐ مجھے نہیں معلوم" امام جعفر نے فرمایا" ابو حنیفہ تم بڑے عقلمند بنتے ہو، یہ نہیں جانتے کہ ہرن کے رباعیہ نہیں ہوتا ہمیشہ ثنی (دو بڑے دانت)[1] ہوتا ہے۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں مصعب بن عبداللہ سے دو روایتیں نقل کی ہیں کہ امام مالک نے بنی اُمیہ کے عہد تک امام جعفر صادق سے روایت نہیں کی۔ جب عباسیوں کا زمانہ آیا تو ان سے روایت شروع کی، ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، لیکن جس خوف سے عہد اموی میں وہ ان سے احتراز کر سکتے تھے، وہ خوف تو عباسیوں کے عہد میں بھی موجود تھا، پھر یہ سیاسی خوف صرف امام مالک ہی کو کیوں ہوتا۔ اس جرم کے مجرم تو اور بھی تھے، اور سب سے اخیر یہ کہ اگر ان کو اس کا ڈر تھا۔ تو اسی عہد اموی میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے کیوں نہ ڈرے، دوسری روایت

---

[1] ابن خلکان ترجمہ جعفر صادق

یہ ہے، کہ امام مالک امام جعفر صادق کے ساتھ جب تک تائیداً دوسرے راوی کو نہیں ملا لیتے تنہا ان سے روایت حدیث نہیں کرتے، یعنی امام مالک، امام جعفر صادق کو ضعیف فی الراویہ سمجھتے ہیں، یہ روایت قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے موطا خود ہمارے سامنے موجود ہے، اکثر روایتیں تنہا امام جعفر سے بغیر ضم راوی آخر موجود ہیں تعجب ہے کہ علامہ ذہبی نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی۔

سنہ ۱۹۸ھ امام جعفر صادق کا سال وفات ہے بعض روایات میں ہے کہ حضرت جعفر صادق نے وفات کے وقت امام مالک کو اپنا جانشین[1] بنایا، لیکن ثقات مورخین کے ہاں مجھ کو یہ روایت نہیں ملی۔

محمد بن المنکدر المدنی کبار تابعین میں ہیں، اپنے باپ منکدر بن عبد اللہ اور حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہم صحابہ عظام سے روایت کرتے ہیں۔ امام زہری، امام ابو حنیفہ، امام مالک، شعبہ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری اور دیگر ائمہ حدیث کے شیخ الروایات ہیں۔ ابن عیینہ کا قول ہے، کہ محمد بن منکدر صدق و راستی کے معدن تھے، صلحائے مدینہ کا ان کے پاس مجمع رہتا تھا۔ سنہ ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن یحییٰ محمد بن یحییٰ انصاری بلند پایہ تابعی تھے۔ اپنے باپ یحییٰ بن حبان اور اپنے چچا واسع بن حبان کے علاوہ کبار صحابہ میں سے انسؓ رافع بن خدیج وغیرہم سے روایت کرتے ہیں۔ امام لیث بن اسحٰق کو ان سے تلمذ ہے، مسجد نبوی میں درس دیتے تھے اور ان کا ایک مستقل حلقہ ہوتا تھا، مدینہ میں فتویٰ بھی دیتے تھے۔ نسائی، ابن معین، ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے، سنہ ۱۲۱ھ ۷۴ برس کے سن میں وفات پائی۔

---

[1] مالک عیسیٰ الزرادی۔ ص، ۱ مصر، ذیل تزئین،

ابو حازم

ابو حازم سلمہ بن دینار کو سہل بن سعدؓ سے جو مدینہ کے آخری صحابی تھے اور جنہوں نے ۹۱ھ میں سو برس کی عمر میں وفات پائی لقا و روایت کا شرف حاصل ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓو بن عاص اور ابن عمرؓ سے بھی روایت کرتے ہیں، لیکن سماع ثابت نہیں، تابعین میں سے محمد بن منکدر، سعید بن مسیب، امام الدردا والصغریٰ، ابو ادریس خولانی سے تلمذ ہے، امام زہری گو عمر و فضل دونوں میں ان سے بڑے تھے، تاہم ان سے حدیث سیکھتے تھے، امام مالک ابن عیینہ، ثوری، حماد وغیرہم ان کے شاگرد تھے۔

محدثین میں یہ ثقہ اور کثیر الحدیث مشہور ہیں، کبھی کبھی مسجد نبوی میں وعظ بھی کہا کرتے تھے ان کے حلقہ درس میں نہایت کثرت سے لوگ بیٹھتے تھے۔ کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ دیر میں آنے والوں کو جگہ ملنی مشکل ہوتی تھی، ایسے ہی موقع پر امام مالک پہنچے جگہ بھر چکی تھی، بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، امام صاحب واپس چلے آئے لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے پسند نہ کیا کہ میں حدیث نبوی کھڑے کھڑے سیکھوں"، امام کا مقصد اس سے یہ تھا کہ بے اطمینانی اور بُعد کے سبب صحت سماع مشکل تھی۔

ابو حازم نے ۱۴۰ھ کے بعد انتقال کیا۔

یحیی بن سعید

ابو سعید یحییٰ بن سعید انصاری، حضرت انس، عدی بن ثابت علی بن زین العابدین بن حسین سے تلمذ ہے، امام مالک شعبہ، ثوری، ابن عیینہ، حماد بن زید، حماد بن سلمہ لیث وغیرہم نے ان کی روایت کی ہے، مدینہ کے عہد قضا پر مامور تھے۔ ابن مدینی کی تحقیق ہے کہ ان کی روایت سے ۳۰۰ حدیثیں ہیں ابن اسعد نے ان کی نسبت لکھا ہے۔ ثقہ کثیر الحدیث حجۃ ثبت سفیان ثوری و سفیان عیینہ نے ان کو "حفاظ" میں شمار کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں سعید اثبت الناس، ۱۴۳ھ سال وفات ہے۔

شیوخ کی تعداد

دیگر شیوخ مدینہ اور بعض شیوخ مکہ و بصرہ و خراسان و جزیرہ سے بھی امام مالک نے روایت کی ہے، موطا میں جن شیوخ سے روایت ہے ان کی مجموعی تعداد شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں پچھتر بتائی ہے، لیکن اسعاف البطا برجال الموطا کے تصفح سے ان کے شیوخ موطا کی تعداد ۹۴ ہے، لیکن یہ تعداد موطا کی ۱۷۲۰ احادیث و آثار کی ہے، ورنہ اصل میں مالک کی احادیث صحیحہ و غیر صحیحہ کی تعداد دس ہزار تھی، تنقید و بحث کے بعد تقریباً ۸۰۰۰ خارج کر دی گئیں۔

علم الفقہ

یہاں تک امام کے شیوخ حدیث کی تفصیل تھی۔ ایک شیخ یا محدث کے فرائض، احادیث کے جمع و روایت، روایات کی تصحیح و تضعیف اتصال و انقطاع، رفع و ارسال، رجال کی توثیق و تضعیف وغیرہ مباحث میں من حیث الروایہ تک محدود ہیں۔ اس کے بعد ایک فقیہ کے حدود حکومت کی ابتدا ہوتی ہے۔ احادیث کا تضاد و تطابق، نسخ و تطبیق اور ان سے احکام کا استنباط و تفریع، ان کے فرض و سنت و استحباب کی تقسیم، غیر مصرح بالنص احکام کا قیاس صحیح ایک فقیہ کے فرائض و خدمات ہیں۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہوا ہوگا، کہ فقیہ کا درجہ محدث سے کتنا بلند ہے اور یہ بھی ثابت ہوا ہوگا کہ ہر فقیہ کے لیے محدث ہونا ضروری ہے، کہ اگر وہ نفس حدیث کی صحت و ضعف، رفع و ارسال، اتصال و انقطاع اور رجال کی ثقاہت و عدل و قوت اور دیگر اسباب جرح و تعدیل سے ناواقف ہے تو وہ استنباط و تفریع و تطبیق و نسخ و دیگر احکام معنوی کی بنیاد کس سطح پر قائم کرے گا! اس بنا پر یہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے، کہ کسی غیر محدث فقیہ کا تخیل کس درجہ مستبعد ہے۔

شیخ الفقہ ربیعۃ الرائی

امام مالک نے فقہ کی تعلیم گو نافع وغیرہ دیگر شیوخ سے بھی پائی، لیکن اس کی تحصیل ابو عثمان ربیعہ الرائی سے خاص طور سے کی ربیعہ مدینہ کے کبار تابعین میں تھے، حضرت انسؓ وغیرہ صحابہ کے دامن تربیت میں تعلیم پائی تھی۔ امام مالک، یحییٰ الانصاری، شعبہ، اوزاعی، لیث وغیرہم جو اس طبقہ کے اکابر رجال و اعیان علم ہیں۔ ان کے شاگرد ہیں، ربیعہ کے ساتھ امام کا اختصاص اس درجہ تھا۔ کہ تاریخ و رجال میں "شیخ مالک" ان کے نام کا جز ہو گیا ہے۔ اجتہاد و استنباط، تفریع و رائے میں اس قدر معروف و ممتاز تھے کہ "رائی" ان کا لقب ہو گیا، امام احمد بن حنبل ان کو "ثقہ" کہتے ہیں۔ ابن شیبہ کا قول ہے کہ وہ ثقہ اثبت اور مدینہ کے مفتیوں میں سے ایک تھے"۔ خطیب نے لکھا ہے کا فقیہاً عالماً حافظاً الفقۃ و الحدیث" یعنی وہ فقیہ، عالم اور فقہ و حدیث دونوں کے حافظ تھے۔"

ربیعہ رائی خاص مسجدِ نبوی میں درس دیتے تھے۔ امام مالک، حسن بصری، شعبہ اوزاعی، الیث مصری، یحییٰ انصاری جیسے علمائے فاضل حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے، قرون اوّل کا مدینہ جو سینکڑوں محدثین و فقہا کا مخزن تھا اس میں فتویٰ دینا ایک خاص لیاقت و قابلیت کا کام تھا، ربیعہ رائی اس خاص لیاقت اور قابلیت کے ساتھ متصف تھے اور منجملہ ان اکابر فقہائے محدثین کے تھے جن کو مدینۃ الرسول کے مفتی ہونے کی سعادت حاصل تھی۔ سفاح جو دولتِ عباسیہ کا پہلا فرمانروا تھا، جب اس نے عہدہ دارانِ حکومت کا انتخاب کرنا چاہا تو قاضی دار الخلافہ کا عہدہ انہی کے سپرد کیا۔ حکومتِ عباسیہ کا پہلا پایہ تخت انبار تھا، یہیں ۱۳۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

ربیعہ رائی کے مسائل و اجتہادات لوگوں میں نہایت مقبول اور پسندیدہ تھے

امام مالک جواب ایک مستقل مجلس درس کے مالک تھے۔ ایک بار اپنی مجلس درس میں ربیعہ رائیؒ کی احادیث و اجتہادات کا ذکر فرما رہے تھے۔ لوگوں کو اتنی دلچسپی ہوئی کہ امام صاحب جب کہہ کر خاموش ہوئے تو عرض کی کہ کچھ اور ان کے اجتہادات و احادیث بیان فرمایئے امام نے کچھ اور بیان کیا۔ لوگوں کی تشنگی اب بھی کم نہ ہوئی خواہش کی کہ کچھ اور ان کے مسائل بیان فرمایئے۔ امام نے فرمایا کہ تم ربیعہ رائیؒ کو کیا کروگے' دیکھو وہاں سوتے ہیں۔ لوگوں کو تسلی نہ ہوئی اور وہاں پہنچے امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ جب سے ربیعہ نے انتقال کیا فقہ کا مزہ جاتا رہا۔

ان کی زندگی کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ یہ ابھی حمل میں تھے کہ ان کے باپ فرخ خراسان کی جنگ میں سپاہی بن کر گئے اور بیوی کو ۳۰ ہزار دینار سپرد کر گئے، وہاں سے ۲۷ برس کے بعد ان کو لوٹنا نصیب ہوا۔ اس اثنا میں ربیعہ جوان ہو کر صاحب کمال ہو چکے تھے۔ مسجد نبوی میں ان کی مجلسِ درس منعقد ہوتی تھی' ماں نے تمام دولت بیٹے کی تعلیم پر صرف کر دی۔ فرخ گھر پہنچے تو اپنا گھر سمجھ کر بلا تردد گھر کے اندر قدم رکھا۔ ربیعہ نے دیکھا کہ ایک غیر شخص اس بے باکی سے اندر گھسا چلا آتا ہے ڈانٹا کہ خبردار جو اندر قدم رکھا۔ فرخ نے جب ایک اجنبی مرد کو گھر کے اندر پایا تو وہ غصہ سے بیتاب ہو گئے، باپ بیٹے نے آستینیں چڑھالیں۔ محلہ والوں میں شور ہو گیا۔ امام مالک کو خبر ہوئی تو وہ دوڑے آئے لوگوں نے امام مالک کو دیکھا تو خاموش ہو گئے' امام مالک نے فرمایا۔ بڑے میاں اور بھی مکانات ہیں وہاں چل کر ٹھہرو" فرخ نے کہا "یہ میرا مکان ہے۔ اور میرا نام فرخ ہے بیوی نے نام سنا تو آواز پہچانی۔ باہر نکل آئی اور باپ بیٹے دونوں کو گلے ملایا۔

جب سکون ہوا تو فرخ نے بیوی سے روپیہ کا حساب پوچھا۔ بیوی نے جواب دیا کہ بحفاظت دفن ہے۔ فرخ جب مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گئے تو بیٹے کو فضل و کمال کی مسند پر متمکن دیکھا' شاداں و فرحاں گھر آئے اور بیوی نے ذکر کیا کہ تم کو اپنے بیٹے

کی یہ جاہ و منزلت عزیز ہے یا وہ ۳۰ ہزار دینار"؟ فرخ نے کہا "اپنے بیٹے کی یہ جاہ و منزلت عزیز ہے"۔ بیوی نے جواب دیا کہ اسی خاک میں میں نے وہ خزانہ دفن کیا ہے"[1]

امام مالک کا انتخاب شیوخ

امام مالک کے شیوخ و اساتذہ کی یہ تعداد اس زمانہ کی کثرت شیوخ کے مذاق کے لحاظ سے نہایت کم ہے۔ اور عجب نہیں کہ اس پر ان لوگوں کو تعجب آئے جو تعداد کو افضلیت کا معیار جانتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس میں بھی امام مالک کے لئے ایک مزیت خاص مضمر ہے

صحابہ کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا۔ یہ دورِ ثانی یا قرن ثانی گو عمومیت اور اکثریت کے لحاظ سے خیر و برکت کا عہد اور صدق و طہارت کا وقت تھا، تاہم زمانہ کا کوئی دور کبھی ایسا نہیں گزرا اور نہ گزر سکتا ہے، جب مجمع النسانی غیر سعادتمندانہ عنصر کے شائبہ سے خالی ہو۔ زمانہ کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ صرف نسبتاً ہو سکتا ہے صحابہ کا قرنِ اوّل اپنے ماقبل و مابعد کی نسبت سے خیر القرون تھا، تاہم وہ ماجزا اور زنِ مخزومیہ و امثالہا کے وجود سے خالی نہ تھا۔ گو یہ ہستیاں بھی قرونِ مابعد کے اخیار و ابرار سے شرفِ صحبت، قوتِ ایمان، اعترافِ قصور، و خشیت الٰہی اور توبہ و ندامت میں بدرجہا بہتر تھیں رضی اللہ عنہم۔

صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ بھی اپنے مابعد کے لحاظ سے برکات کا مجمع اور کمالات کا منبع تھا، تاہم مادی آبادی طوائفِ النسانی کے جو اقسام ہیں، ان سے یکسر پاک نہ تھا۔ بیسیوں آدمی قصداً جھوٹ بولتے تھے۔ بیسیوں آدمی اپنی غایت زہد و سادہ دلی سے ہر بولنے والے کو سچا سمجھ کر بلا تامل اس کی بات نقل کرتے تھے، اور اس طرح نادانستہ کذب بیانی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ سینکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے جو اپنے

---

[1] ربیعہ کے یہ تمام حالات ابن خلکان و اسعاف المبطا ترجمۂ ربیعہ سے ماخوذ ہیں۔

روایات کا خود محل و مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ اس زمانہ کی آب و ہوا میں روایت حدیث اور اشاعت قول نبوی کا مذاق پھیلا تھا اور یہ ہی اس وقت عز و شرف کا ذریعہ تھا۔ اس لئے اہل فضل اور مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو نا اہل اور غیر مستحقین بھی اپنی مسند بچھاتے پھرتے تھے۔ باہر کے ناواقف آفاقی جن میں زیادہ تر عراقی تھے، ہر سپید کو سیم خالص سمجھ کر ہر ڈھیر سے بلا تمیز ایک خروارہ اٹھاتے پھرتے تھے اور اس بار گراں کے ساتھ جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے کو سب سے بڑے ڈھیر کا مالک سمجھ کر خوش ہوتے تھے

امام مالک کا مدینہ وطن تھا۔ بچپن سے علماء میں تربیت پائی ایک ایک صاحب حدیث سے برسوں ملاقاتیں رہیں، ہر ایک سرمایہ دار کی جنسِ متاع کے ایک ایک ذرہ سے واقف تھے اور درحقیقت یہ غیر ممکن ہے کہ غیر مستحقین کی نااہلیت خود اپنے ارباب وطن سے مخفی رہے۔

خصوصیاتِ شیوخ امام

امام مالک نے صرف انہی اساتذہ فن سے اخذ کیا جو اہلیت و استحقاق کے مسند نشین تھے اور صرف ان شیوخ کے حلقہ درس میں بیٹھے جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے۔ امام ممدوح ہمیشہ تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف حضرت امام مالکؒ کے حصہ میں آئی۔" امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس صحنِ مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا۔ جو "قَالَ رسولُ اللّٰہ قَالَ رسول اللّٰہ" کہا کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا" کبھی فرماتے مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے۔ جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا۔ یہ چند قسم کے لوگ تھے۔ بعض لوگ نادانستہ جھوٹ بولتے تھے۔ بعض مغز سخن سے ناواقف تھے

بعض پورے جاہل تھے۔

ابنِ وہب جو امام صاحب کے نامور شاگرد ہیں ذکر کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ مدینہ میں ایسے کتنے مقدس لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا۔ اور بہت سے احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی۔ لیکن مَیں نے ان سے استفادہ نہیں کیا، کیونکہ وہ صرف متقی وزاہد تھے۔ اور یہ حدور روایت اور فتوٰی کا کام صرف زہد و اتقاء اور سادگی سے نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے اتقاء و پرہیزگاری کے ساتھ علم وفہم اور پختگی کی حاجت ہے وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے' اور قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا۔ جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو۔ وہ اس راہ میں مفید نہیں۔ اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسوں سے اخذ علم کرنا چاہیئے۔"

امام مالک کے بھانجے اسمٰعیل بن ابی اویس روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں مالک کو کہتے سنا ہے، کہ "یہ علم حدیث دین ہے، ذرا دیکھ لو کہ کس سے حاصل کرتے ہو۔ میں نے ان ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہتے سنا۔ لیکن مَیں نے ان سے ایک حرف نہیں سیکھا، حالانکہ ان میں سے ہر شخص اس لائق تھا کہ اگر ایک خزانہ بھی ان کے سپرد کر دیا جاتا تو ان کی ایمانداری اور دیانت کے شیشہ میں بال نہ آتا۔ لیکن وہ اس فن کے آدمی نہ تھے۔

مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مَیں نے امام کی زبان سے ان کا قول سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ "میں نے اس شہر میں بہت سے نیک وصالح لوگوں کو پایا۔ لیکن ان سے میں نے حدیث نہیں سنی۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا "جو وہ کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے۔"

امام صاحب نے اہلِ عراق سے کیوں روایت نہیں کی

امام کے

شیوخ میں کوئی عراقی نہیں ہے ابو مصعب جو امام صاحب کے شاگرد اور مشہور محدث ہیں وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اہلِ عراق سے کیوں روایت نہیں کی۔ جواب میں فرمایا کہ "میں کیا ان سے روایت کروں؟ میں نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ یہاں آکر ان لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جا سکتا ابو مصعب کا بیان ہے کہ "میں نے کہا کہ وہ اپنے شہر میں بھی ایسے ہی لوگوں سے روایت کرتے ہیں"۔ اسی قسم کا سوال ایک بار امام مالک سے شعیب بن حرب نے کیا کہ آپ لوگ اہلِ عراق سے کیوں نہیں روایت کرتے؟" امام صاحب نے کیا معقول جواب دیا۔ فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی، اس لئے ہمارے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی"۔

امام مالک جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذ کرنا چاہتے تھے، تو ہمیشہ ان کا تجربہ ونقد کر لیتے تھے، امام کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جاتا ہے تو وہ بصرہ کے ایوب سختیانی مشہور تابعی المتوفی سنہ ۱۳۱ھ ہیں، جن کی نسبت ابن سعد کہتے ہیں۔ کان حجۃ ثقۃ ثبتاً فی الحدیث جامعاً کثیر العلم اور جن کو شعبہ نے سید الفقہاء کا خطاب دیا ہے، اور جن کا نام رجال میں احد الائمۃ الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں حج کے موقعہ پر ان کو دو سال میں نے دیکھا۔ لیکن ان سے کوئی حدیث نہیں لکھی، تیسرے سال دیکھا کہ وہ صحن زمزم میں بیٹھے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا جاتا تو وہ اتنا روتے کہ مجھ کو رحم آتا تھا، جب یہ حال دیکھا تو ان کی حدیث لکھی۔

اپنے دادا اور فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی

تعجب ہوتا ہے کہ امام جب سن رشد کو پہنچے، تو اس وقت آپ کے دادا مالک بن ابی عامر زندہ تھے، ان کی وفات

کے وقت امام کی عمر ۱۲/۱۳ برس کی تھی، فقہائے سبعہ میں سے سالم بن عبداللہ نے سنہ ۱۰۶ھ میں وفات پائی، جب کہ امام کی عمر ۱۶ برس کی تھی، سلیمان بن یسار نے سنہ ۱۰۷ھ میں انتقال کیا۔ اور اس وقت امام ۱۷ سال کے تھے، تاہم ان بزرگوں سے بلا واسطہ کوئی روایت نہیں کی۔ اس کا سبب خود امام صاحب نے بیان فرما دیا ہے، کہ مدینہ میں بعض لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے، کہ وہ ۱۰۰ برس ۱۰۵ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے، اور اگر کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا” اور یہ بالکل سچ ہے، کیونکہ عمر کے ضعف کا حفظ و عقل کے ضعف پر جو اثر پڑتا ہے، اس کا کون انکار کر سکتا ہے؟

امام مالک کے اس احتیاط و تمیز کا نقد کا یہ اثر ہوا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے، وہ ثقاہت و عدالت و حفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا۔ یحییٰ بن معین جو مبصرین فن حدیث کے امام ہیں، فرماتے ہیں کہ ”ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں؟ ہم لوگ تو امام مالک کے نقشِ قدم پہ چلتے ہیں، جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ امام مالک نے اس سے لیا ہے یا نہیں، اگر نہیں لیا ہے، تو چھوڑ دیتے ہیں۔ احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا، انہوں نے فرمایا، کہ میرے نزدیک وہ اچھا ہے، کیونکہ امام مالک نے اس سے روایت کی ہے[1]۔“

امام مالک فطرۃً قوی الحافظہ تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانۂ دماغ میں آ کر پھر نہ نکلی[2] اور خود دوسروں کو اس کا اعتراف تھا، ابو قلابہ کہتے ہیں کان مالک احفظ اهل زمانه[3] ایک بار جب استاد ربیعہ کی معیت میں امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے، امام زہری نے اس دن چالیس سے زیادہ حدیثوں کا املا کیا، دوسرے

---

[1] ان تمام اقوال کے لئے دیکھو مقدمۂ اسعات [2] تذکرۂ ذہبی ترجمۂ مالک

[3] تزئین الممالک صفحہ ۹ مصر

دن پھر مجلس منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاد کے ساتھ پھر حاضر ہوئے امام زہری نے کہا، کتاب لاؤ میں اس سے بیان کروں، کل جو میں نے بیان کیا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا؟ ربیعہ نے کہا اس مجلس میں، ایک شخص ہے، جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنا دے گا۔ زہری نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر! زہری نے اشارہ کیا کہ سناؤ امام صاحب فرماتے ہیں کہ چالیس حدیثیں میں نے سنائیں، زہری نے تعجب سے کہا کہ میرا خیال تھا کہ میرے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں[1]

شوق علم اور فراغ قلب بہت کم مجتمع ہوئے ہیں۔ امام بخاری پر ایک وقت تین دن ایسے گزرے ہیں، جن میں انہوں نے جنگل کی بوٹیوں پر قناعت کی ہے، اور یہ ان کی زندگی کا مشہور واقعہ شمار ہوتا ہے۔ امام مالک بھی اس راہ میں پیچھے نہیں ہیں، فقر سے نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دستِ طلبِ علم کو تاہ نہیں کیا[2]۔ اسی لیے امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ لا یبلغ احد ید من ھذا العلم حتی یضربہ الفقر دثرہ علیٰ کل حال" یعنی اس علم میں کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور اس پر بھی وہ بہر حال طلب علم کو ترجیح نہ دے[3]۔ امام مالک طلب علم کے لئے بجز موسم حج کے مدینہ سے باہر نہیں نکلے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے، کہ ان کو طلب علم کے لیے محنت نہیں اٹھانا پڑی ابن سعد نے امام مالک سے بیک واسطہ روایت کی ہے کہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کو مقرر تھا۔ دوپہر کی دھوپ میں بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا۔ جہاں ان کا مسکن تھا، مدینہ کے ایک فقیہ ابن ہرمز تھے ان کے گھر صبح کو آتا تھا تو رات کو جاتا تھا۔

---

[1] تزئین الممالک صفحہ ۱۲ مصر [2] تذکرہ ذہبی [3] تزئین نقلا عن الحلیۃ لابی نعیم ص ۱۵ مصر [4] طبقات۔

شغلِ درس و تدریس شان و رفعت

گذشتہ باب میں معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب کی لیاقت و استحقاق کا اعتراف عام طور سے کیا جاتا رہا ہے اور اس بنا پر خود امام کے شیوخ کی موجودگی میں مستفیدین کا الگ حلقہ قائم ہو چکا تھا۔[1] شیخ الفقہ ربیعہ المتوفی ۱۳۶ھ زندہ ہی تھے کہ امام مالک فقہ و فتوی کے مرجع بن گئے۔ اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو فقہ رائی و اجتہاد کے مجمع علیہ امام تسلیم کر لیے گئے۔ ابن لہیعہ جو مصر کے ایک شیخ حدیث ہیں انہوں نے شیخ مدینہ ابو الاسود نعیم بن عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ "ربیعہ کے بعد مدینہ میں فقہ و اجتہاد کا امام کون ہے"؟ انہوں نے جواب دیا کہ "نوجوان صبحی[3]" (مالک بن انس اصبحی)۔

مجلس حضرت ابن عمرؓ

فن حدیث میں امام صاحب کے خاص شیخ حضرت نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہما تھے، حضرت عبداللہؓ بن عمر صحابہ میں آنحضرت صلعم کے اعمال و سنن کے سب سے زیادہ عالم تھے۔ امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے مناقشات کے موقع پر بعض صحابہ کی رائے تھی کہ حضرت ابن عمر خلیفہ اسلام ہوں، آپ نے فرمایا کہ ایسی خلافت جس میں کسی مسلمان کا ایک قطرہ بھی خون کا گرے مجھے منظور نہیں"۔ اکثر صحابہ فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد ابن عمرؓ کے سوا ہر شخص کچھ نہ کچھ بدل گیا۔ حضرت ابن عمرؓ آنحضرت صلعم کے بعد ساٹھ برس تک حدیث و فقہ و ارشاد کے مرکز رہے۔

---

[1] تزئین الممالک صفحہ ۱۰ عن ابی نعیم فی الحلیہ۔

[2] ابن خلکان ترجمہ مالک۔ [3] تزئین الممالک صفحہ ۹ عن الغافقی

مجلس نافع

حضرت نافع کامل ۳۰ برس تک سفر و حضر، قیام و قعود، لیل و نہار خلوت و جلوت میں ہمیشہ حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رہے اور ان کے بعد ان کی مجلس درس میں ان کے جانشین رہے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی، امام مالک کم ازکم بارہ برس حضرت نافع کے درس میں رہے۔

مجلس مالک

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشین ہوئے، شعبہ جو کوفہ کے راس المحدثین تھے، وہ بیان کرتے ہیں، کہ نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ امام صاحب نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلس درس قائم کی۔

امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پُرتکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسطِ مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب صرف املائے حدیث کے موقع پر رونق افروز ہوتے تھے، جابجا شرکائے مجلس کے لئے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا، مجمر میں عود و لوبان جلایا جاتا، صفائی و نزاکت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ہوتا تھا، جب حدیث نبوی کے املاء کا وقت آتا، پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے اور اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لیے باہر تشریف لاتے۔

تمام لوگ سرنگوں خاموش مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آکر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے، اس وقت امام صاحب کی ادا سے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، تمام مجلس پر ایک

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ترجمہ مالک۔

[2] تزیین الممالک نقلاً عن ابی نعیم و الغافقی صفحہ ۱۳، ۱۶ و بستان المحدثین ترجمہ مالک

[3] تذکرہ ذہبی ترجمہ مالک۔

مقدس سکوت طاری رہتا تھا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں اُلٹتے تھے کہ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز نہ ہو، جاہ وجلال اور شان و شکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہِ شاہی کا دھوکا ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم مستفیتوں کا ازدحام، امرا کا ورود، علما کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مؤدب نشست درخانہ پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب وقار طاری کر دیتا تھا، اسی موقع پر ایک شاعر کا گذر ہوا تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ دو شعر نکل گئے۔[1]

یدع الجواب فما یراجع ھیبۃ والسّائلون نواکس الازقان

(ترجمہ) اگر امام جواب نہیں دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جا سکتا، پوچھنے والے سر نیچے کیے رہتے ہیں۔

ادب الوقار وعز سلطان التُّقیٰ فھو المہاب ولیس ذا سلطان

(ترجمہ) وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ وجلال ہے، لوگ اس سے ڈرتے ہیں ہیں، حالانکہ یہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

ہاں امام صاحب حکومت نہ تھے، لیکن صاحبِ حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے امام شافعی نے اپنی تعلیم کے لیے والیٔ مدینہ کو بغرض سفارش، جب درِ امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا میرا کہاں وہاں گذر" ہارون رشید جب مدینہ آیا تو امام صاحب سے موطا کی سماعت کی خواہش ظاہر کی، امام صاحب نے فرمایا کہ "کل کا دن اس کے لیے ہے، ہارون رشید اس کا منتظر رہا کہ امام صاحب دربار میں خود آئیں گے کل کا دن آیا تو امام صاحب اپنی مجلس درس میں تشریف فرما رہے، ہارون رشید نے پوچھا تو فرمایا کہ العلم یزار ولا یزور" علم کے پاس لوگ آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا، آخر ہارون الرشید کو با ایں ہمہ جاہ وجلال خود امام کی مجلس میں حاضر ہونا پڑا۔[2]

---

[1] توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس ابن حجر [2] تزئین نقلاً عن الخطیب صفحہ ۱۷،

مجلس میں عام و خاص کی تمیز نہ تھی۔ ہارون نے جب درس کی شرکت کا ارادہ کیا تو کہا کہ عام لوگوں کو باہر کر دیجئے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ شخصی منفعت کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔[1] اللہ اکبر کیا پاک روحیں تھیں۔

مجلس درس

حدیث کا املا مسجد نبوی یا مجلس درس سے باہر نہیں کرتے تھے مہدی اور ہارون دونوں نے خیمہ خلافت میں املا کی خواہش کی لیکن امام نے انکار کر دیا۔ جلدی میں یا کسی کام میں مصروفیت میں، یا راہ چلتے ہوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے، کہ خلاف ادب ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ سماع و فہم حدیث کے لیے اطمینان اور حضور قلب چاہیے، جو ان موقعوں پر عموماً مفقود ہوتے ہیں، اس لیے احتراز فرماتے تھے، مجلس میں زور زور بولنا بھی خلاف ادب تھا۔ ایک بار خلیفہ منصور امام سے مسجد میں مناظرہ کر رہا تھا۔ آواز نہایت بلند ہو رہی تھی۔ امام نے ڈانٹ کر یہ آیت پڑھی۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ "پیغمبر کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو"

عادت شریف یہ تھی کہ صبح کی نماز کے بعد طلوعِ صبح تک مصلیٰ پر درود وظائف میں مشغول رہتے۔ طلوع صبح کے بعد لوگ آنا شروع ہوتے، امام صاحب لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ایک دو آدمیوں سے خیریت پوچھتے، مجلس کی یہ ترتیب تھی کہ قریب تر جیّد و مستعد و صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے پھر علیٰ قدر المراتب لوگ آ آ کر بیٹھتے جاتے ابتدائے درس سے پہلے فرما دیتے کہ مستعد و صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں" املا آہستہ اور سکون کے ساتھ کرتے، ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری حدیث شروع کرتے۔

مختلف شیوخ کی مجالس میں درس کا طرز مختلف تھا۔ اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلبہ بہ ترتیب پس و پیش قلم دوات

---

[1] مناقب مالک، لابن مسعود الزدادی صفحہ ۲۹ مصر

لے کر بیٹھ جاتے۔ شیخ زبانی یا اپنا جزو حدیث ہاتھ میں لے کر اس سے املا کرتا، طلبہ لکھتے جاتے تھے۔ مجلس درس میں اگر غیر معمولی اجتماع ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملی کھڑے ہوتے، جو شیخ کے الفاظ بعینہ آگے کو پہنچاتے۔ امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ سے درس دیتے تھے۔ ابن علیہ جو ایک جیّد شاگرد تھے۔ امام کے مستملی تھے۔

لیکن مدینہ کے اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا۔ کہ وہ اپنی احادیث وفتاویٰ وتعلیقات کو پہلے قلمبند کر لیتے یا کسی مستعد وصاحب فہم شاگرد کو لکھنے پر مامور کرتے، لکھے ہوئے اجزا کاتب کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ مجلس میں اس کو پڑھتا، شیخ جابجا اس کے مطالب کی تشریح کرتا جاتا، کاتب سے غلطی ہوتی اس کی تصحیح کر دیتا۔ امام صاحب کے کاتب کا نام ابن حبیب تھا۔ جن کا شمار محدثین کبار میں ہے۔ اور کبھی معن بن عیسیٰ یا اور دیگر تلامذہ پڑھتے۔ یہی سبب ہے کہ امام کے بعض تلامذہ مثلاً یحییٰ جن کی روایت بخاری میں ہے۔ حدثنا مالك و اخبرنا مالك[1] کے قرأت علی مالك کہتے ہیں۔

امام صاحب اس اصول کی اکثر بشدت پابندی کرتے تھے، یحییٰ بن سلام اسی بات پر ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ گئے کہ خود نہیں پڑھتے شاگردوں سے پڑھواتے ہیں، یحییٰ بن سلام تو خیر ادنےٰ شاگرد تھے، خود خلیفہ وقت ہارون نے امین و مامون کے لیے کہا کہ آپ پڑھیے یہ سنیں تو شیوخ مدینہ کا نام گنا کر فرمایا کہ "ہمارے شہر کے شیوخ کا یہی دستور تھا" اور کیا عجب بات ہے۔ کہ جس امر پر لوگوں کو اس قدر اصرار تھا، وہی آج ایک مدت سے تمام مدارس اسلامیہ کا دستور عام ہے۔

اس طریقہ کی خوبی

شیوخ مدینہ کا یہ طریقہ متعدد وجوہ سے افضل و احفظ ہے مجمع عام میں جب کوئی شخص بولنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو عموماً عجلت، بکثرت ازدحام اور کبھی مرعوبیت کے سبب سے اس میں مسامحت ممکن ہے

---

[1] تزیین نقلاً عن فضائل مالک لابن فہر۔

بخلاف اس کے اگر پہلے سے لکھ لیا جائے تو فراغِ خاطر، اطمینان قلب اور فرصتِ فکر و مراجعت کے سبب سے صحت و حفظ و وثوق کے ذرائع زیادہ ہیں۔ محدث کا خود قرأت نہ کرنا اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ وہ دوبارہ سن کر اپنے مسودہ کو تصحیح کر سکے کیوں کہ خود پڑھنے میں اکثر دیکھا گیا کہ زبان و نظر اپنی یاد کی بنا پر غلط لکھے ہوئے کو بھی صحیح پڑھتی ہے، دوسرا اجنبی شخص ہر سطر پر بار بار ٹھہرتا ہے۔ اور اس طرح معلم کو ہر مرتبہ غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی بہتر مصلحت اس میں یہ ہے کہ اکثر فقہاے احادیث احادیث و آثار کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و رائے یا کسی لغت کی شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے، چنانچہ امام زہری کا یہی طرز تھا، لیکن اس طرز میں ایک بڑی خرابی یہ ہے، کہ اکثر طلبا اصل اور اضافہ میں تمیز نہیں کر سکتے تھے، متن حدیث اور شیخ کے کلام میں ان کو اشتباہ ہوتا تھا۔ امام مالک کا جو طرز تھا، وہ نہایت محفوظ تھا، اصل تو کاتب پڑھتا تھا۔ اور اضافہ خود اپنی زبانِ مبارک سے ادا کرتے تھے۔ اسی طرح ہر طالب علم کو اصل و اضافہ و ادراج میں فرق معلوم ہو جاتا تھا،

ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ علم دین کا مرکز تھا۔ دوسرے یہ کہ امام ہمام کا خاندان ابتدا سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا۔ ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پر و بال نکالے کہ دُنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہوئی اور امام کی درسگاہ اختلاف مرز و بوم کی بوقلموں زار بن گئی ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسول کی سرحد میں آکر مل گئے۔ (ممالک عرب) مدینہ، مکہ، صنعا، ایلہ، سیراف، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضر موت، زبید، مذک، بلقا (ممالک شام) دمشق، عسفان، خلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت

المقدس۔ اردن ۔ صور۔ انطاکیہ (ممالک عراق) بغداد۔ بصرہ۔ کوفہ۔ حران۔ موصل جزیرہ۔ واسطہ۔ انبار۔ رقہ۔ رہا (ممالک عجم) جرجان۔ کرمان۔ ہمدان۔ رے طالقان۔ نیشاپور۔ طبرستان۔ طوس۔ مدائن۔ قزوین۔ قوہستان۔ صغان۔ آمد کردستان۔ دینور۔ سجستان (ممالک ترکستان) ہراۃ۔ بخارا۔ سمرقند۔ خوارزم۔ مرو۔ سرخش۔ ترمذ۔ بلخ۔ فسا (ممالک مصر) مصر۔ اسکندریہ۔ فیوم۔ اسوان۔ تنیس (ممالک افریقہ) فریقیہ۔ تونس۔ قیروان۔ برقہ۔ طرابلس۔ مغرب۔ مراکش (ممالک اندلس) طلیطلہ، لبسطہ، باجہ۔ قرطبہ۔ سرقسطہ (اٹلی) سسلی (ایشیائے کوچک) ازمیر یعنی سمرنا[لہ]۔ الغرض ایشیا۔ قرطبہ۔ سرقسط ہر سہ معلوم براعظم سے مسافران علم کے کاروان بلاانقطاع مدینہ کا رُخ کرنے لگے اور اس طرح پیغمبر مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

عن ابی هریرة عند الترمذی وابن حبان والطبرانی، وعن ابی موسیٰ الاشعری عند الحاکم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل فلا یجدون احدا اعلم من عالم المدینة واللفظ للترمذی قال الترمذی هذا حدیث حسن

ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے، کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لیے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

جغرافی وسعت سے قطع نظر کر کے اگر مستفیدین و تلامذہ کے حلقہ پر نظر کی جائے تو ہماری حیرت میں متعدد وجوہ سے اضافہ ہو جاتا ہے، کہ ایک شخصیت ایک یونیورسٹی کا کام کیونکر انجام دیتی تھی۔

[لہ] خطیب نے رواۃ عن مالک میں جن لوگوں کے نام لکھے ہیں، ہم نے سیوطی کی تزئین الممالک کے حوالہ سے ان شہروں کے نام دیکھ کر جمع کر لیے ہیں۔

امام صاحب کے شاگرد اور حلقۂ مستفیدین

اس حلقۂ درس نے کس قسم کے اشخاص پیدا کیے؟ اور اس فیضِ عام کا اثر کہاں تک پھیلا؟ اس کا جواب امام کے مسترشدین و مستفیدین و تلامذہ کی فہرست سے ظاہر ہوگا۔ محدث ذہبی لکھتے ہیں "وحدث عنہ اسم لا یکادون یحصون"۔ امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے کہ جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے۔[1] تلامذہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اور علماء کی مجلس سے فضل و کمال کی سند حاصل کر چکے تھے۔ بلکہ امام کے شیوخ بھی امام کے احسان علمی سے سبکدوش نہ تھے۔ خود امام مالک فرماتے تھے۔ کہ بہت کم ایسے لوگ ہیں، جن سے میں نے سیکھا ہے، اور آخر ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی۔[2]

تلامذہ کی خصوصیات

امام کو اپنے تلامذہ و مستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں۔ جس کثرت، جس رتبہ اور جس طبقہ کے لوگ امام کے حلقۂ فیض میں داخل ہیں، تمام محدثین میں فقہاء میں کسی کو نصیب نہیں وذالك فضل الله يؤتيه من يشاءُ والله ذو فضل عظيم۔

کثرتِ عدد

۱۔ کثرت تعداد کے لحاظ سے امام مالک کے مستفیدین و تلامذہ کی تعداد ۱۳۰۰ سے زیادہ ہے۔[3] ہم کو معلوم ہے کہ امام بخاری کے شاگرد فربری کی روایت کے مطابق بخاری کے شاگردوں کی تعداد ۹۰۰۰ ہے۔ لیکن اگر عوام و خواص کی کثرت و قلت کوئی قابل امتیاز شے ہے تو نوے ہزار عام انسانوں کی بھیڑ ان تیرہ سو

---

[1] تذکرۂ ذہبی ج ۱ ص ۱۹۰ حیدرآباد دکن [2] تقریب التہذیب مالک بن انس" [3] تزئین الممالک نقلاً عن فضائل مالک بن محمد الزہرانی ص۴

منتخب روزگار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جن میں باستثنائے چند (۴ یا ۸) ہر ایک اس فن کا نکتہ دان اور بلند پایہ محدث ہے، اور یہ کون نہیں جانتا کہ یکے مرد جنگی بہ از صد ہزار۔

شہرت و معرفت

۲، امام بخاری کے نوے ہزار عام رواۃ کے حالات بجز ایک تعداد مخصوص (شاید ۱۰ یا ۵) مجہول و مستور اور نام بنام غیر معلوم ہیں، لیکن امام مالک کے رواۃ و تلامذہ نام بنام ایک ایک حالاً و جرحاً و تعدیلاً معلوم و مشہور ہیں، ابوبکر الخطیب بغدادی، ابن بشکوال، اندلسی، قاضی عیاض شمس الدین دمشقی۔ حافظ سیوطی نے ایک ایک کو گن دیا ہے، ان کو حدوداً و ترتیباً بترتیب ہجا رسائل میں جمع کر دیا ہے۔ فشتان بینہما۔

۳، عموماً عام محدثین کے تلامذہ کی جغرافی حیثیت اس قدر وسیع نہیں، جس قدر امام مالک کی، ہم اس سے پہلے باب میں بہ تفصیل ایک ایک ملک و شہر کا نام لکھ چکے ہیں، امام ابوحنیفہ کے تلامذہ تمام عجم و عرب میں پھیلے تھے، لیکن افریقہ و اندلس ان سے بے نیاز رہا، امام اوزاعی کا علم اندلس میں پھیلا، لیکن ممالک عجم ان سے مستقید نہ ہوئے، لیکن امام مالک کے علم و معارف نے دنیائے اسلام کے ایک گوشہ کو بھی اپنی غلامی سے آزاد نہ چھوڑا

در دیر و حرم کیست کہ آزاد بماند ست

فضل و کمال

لیکن ہمارے نزدیک تلامذہ کی کثرت اور جغرافی وسعت اس قدر مایہ فخر نہیں ہے، جس قدر ان کا علوئے مرتبہ، رفعتِ کمال اور کثرتِ فضل، امام مالک اپنے ہمسروں میں جس قدر اس حیثیت خاص میں ممتاز ہیں، اس کو محض عطیہ الٰہی سمجھنا چاہیئے جو صرف عالم مدینہ کے لیے مقدر تھا، امام المحدثین زہری شیخ مالکؒ، امام الحدیث، جعفر بن محمد شیخ مالک امام الحدیث، یحییٰ بن سعید انصاری تابعی شیخ مالک امام القراء نافع بن ابی نعیم شیخ مالک ہشام بن عروہ فقیہ مدینہ، امام ابوحنیفہ،[1]

---

[1] رواۃ مالک للخطیب البغدادی، ابن عساکر، مسند امام ابوحنیفہ ابن خسرو، دار قطنی کتاب الذبائح ص

امام شافعی، ناقد الحدیث یحییٰ بن سعید القطان، سفیان ثوری امام کوفہ، اوزاعی فقیہ کوفہ، امام محمد، قاضی ابو یوسف وکیع بن الجراح، ابن ابی ذہب فقیہ مدینہ، عبد اللہ بن دینار تابعی شیخ مالک، سفیان بن عینیہ امام الحدیث، حجۃ الحدیث شعبہ بن الحجاج، امام السیر موسیٰ بن عقبہ شیخ مالک، ناقد الحدیث، عبد الرحمٰن بن مہدی امام الحدیث ابن جریج وغیرہم ائمہ کبار و ارباب فن امام مالک کے حلقہ مستفیدین و تلامذہ میں داخل ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی اقلیم کا مستقل فرمانروا ہے۔

تنوع طبقات

۵۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ایک عجیب شے یہ ہے، کہ امام کا حلقہ افادہ اتنے مختلف الانواع طبقوں کو مشتمل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختلف سمت وجہت کے خطوط کیونکر ایک ہی مرکز کی طرف رجوع ہوئے۔

خلفائے اسلام

ابو جعفر منصور، مہدی، موسیٰ، ہادی، ہارون رشید، محمد امین، عبد اللہ مامون۔

امرائے بلاد

حسن بن مہلب شیبانی امیر خراسان، عبد اللہ بن سعید، عبد الملک بن مروان اموی، ہاشم بن عبد اللہ التجیبی امیر برقہ (افریقیہ)

تابعین وشیوخ امام

ابن شہاب زہری یحییٰ بن سعید انصاری۔ محمد بن عبد الرحمٰن ابو الاسود، شعبہ، نافع القاری ابو حنیفہ، ہشام بن عروہ۔ ربیعہ رائی، ابو سہیل نافع، سفیان ثوری، حماد، ایوب سختیانی

ھ۔ بدر الدین زرکشی فی النکت علی ابن الصلاح، مسند ابو حنیفہ لابی الضیاء، الکمال الاکمال قلمی کتب خانہ بانکی پور فن حدیث نمبر ۲۱۳ شرح زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴ مصر، تزیین الممالک سیوطی ص ۱۵۸، المحلی شرح موطا مولانا عبد السلام حنفی مقدمہ ان تمام کتابوں میں امام ابو حنیفہؒ کے استفادہ کا تذکرہ ہے۔

محمد بن مطرف، ابو غسان، عبداللہ بن دینار، یزید بن عبداللہ وغیرہم۔

ائمہ محدثین

محمد بن عجلان، حیات بن شریح، سلام الیتمی، یحیٰی بن بکیر، یحییٰ مصمودی، زید بن اسلم اوہیب بن خالد، ابن ابی ذئب، وکیع بن جراح، ولید بن مسلم الدمشقی، خالد امام خراسان مسلم بن خالد الزنجی، سلیمان اعمش، زبیر بن بکار، ابراہیم امام مصیصہ، عبدالرحمٰن بن مسلمہ تعنبی، ابن لہیعہ، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالعزیز بن محمد الدراوردی ابو نعیم فضل بن وکین عبدالملک بن جریج، عبدالرزاق بن ہمام، لیث بن سعد، شیخ الاسلام محمد بن مبارک، ہیثم بن جمیل محدث انطاکیہ قتیبہ بن محدث خراسان، حافظ الحدیث ابو محمد زہرانی، سلیمان بن داؤد طیالسی معن بن عیسٰی، ابو مصعب زبیری، ابو حذافہ سہمی وغیرہم۔

ائمہ مجتہدین

امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام محمد، امام ابی یوسف، امام ابن قاسم مالکی۔

فقہاء

حسن بن زیاد لولوی صاحب ابی حنیفہ، عبداللہ بن وہب مفتی مصر، ابو عمر اشہب فقیہ مصر، اسد بن فرات فقیہ افریقہ۔

قضاۃ

ابراہیم بن اسحٰق قاضی مصر، ایوب بن سوید قاضی سرد۔ اسد بن عمر قاضی، احرم بن حوشب قاضی ہمدان، داؤد بن منصور قاضی مصیصہ، شریک بن عبداللہ قاضی، افریقیہ یحیٰی بن بکیر قاضی کرمان ابن اشرس العمری قاضی طرسوس، محمد بن عبداللہ الکنانی قاضی افریقہ، اسد بن فرات قاضی سسلی (اٹلی) زیاد بن لبیط قاضی طلیطلۂ (اسپین) محمد بن قاضی باجہ (اسپین)۔

زہاد و صوفیائے کرام

ابراہیم بن ادھم ، ابونصر بشر بن حارث الزہد، ثابت بن محمد الزاہد الکوفی حسن بن حسین بن عطیۃ الصوفی ، ذوالنون مصری ، کارح بن رحمہ زاہد، محمد بن فضیل بن عیاض زاہد۔

ادبائ شعراء

ابوالعتاہیہ شاعر، دعبل شاعر، محمد بن عبدالملک القعبنی شاعر، عبدالملک اصمعی لغوی عمر بن سہل المازنی البصری نحوی۔

مورخین

احمد بن محمد بن ولید الازرقی صاحب تاریخ مکہ، موسیٰ بن عقبیٰ صاحب سیرت نبوی، محمد بن عمر الواقدی صاحب تصانیف کثیرہ، علی بن محمد مدائنی صاحب انساب و تصانیف کثیرہ۔

مفسر

مقاتل بن سلیمان صاحب التفیر

فلسفی

احمد بن محمد صاحب بیت الحکمہ بغداد

اس عہد کے بعد تمام محدثین کبار بلا استثنا امام مالک کے بیک واسطہ یا بدو واسطہ تلمذ سے مشرف ہیں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ابوداؤد نسائی، مسانید و صحاح کے یہ تمام مصنفین صرف ایک واسطہ سے امام کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پہ ناز و فخر ہے۔ یہ ناز و فخر آٹھویں صدی تک باقی ہے۔ جب کہ محدث کبیر شمس الدین ذہبی فخریہ لکھتے ہیں کہ سات واسطوں سے امام کا شاگرد ہوں"۔ امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام سے قریب نسبت پر ناز ہے۔ مقدمہ شرح مسلم

میں اپنے اسناؤ کے حال میں لکھتے ہیں۔

قد وقع لنا اعلیٰ من هذه الکتب وان کانت عالیة مؤطا الامام مالک بن انس وهو شیخ الشیوخ المذکورین کلهم۔

ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری مسلم ترمذی۔ ابوداؤد، نسائی سب سے بہتر ملی، اور وہ امام مالک کی مؤطا ہے۔ جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے۔

امام مالکؒ ایک فقیہ اور مفتی کی حیثیت سے

فقیہ و محدث کا فرق

ایک مفتی اور فقیہ کا فرض ایک محدث سے زیادہ ہے محدث صرف ایک سرمایہ دار ہے۔ فقیہ اس سرمایہ کو لے کر عالم کاروبار میں آتا ہے۔ کھرے کھوٹے کی تمیز، احکام کی تفریع عموم کی تخصیص، خصوص کی تعمیم، مطلق کی تقلید، مقید کا اطلاق، ناسخ و منسوخ کی تفریق، اوامر و سنن کی ترتیب، احکام غیر منصوصہ کا قیاس، احکام کے علل و مصالح کی تلاش، ضروریات انسانی کے مطابق احکام شرعیہ کا اعلان، رعایا و حکومت کے لئے قوانین کی تدوین یہ ایک فقیہ و مفتی کے عام فرائض ہیں۔ جو ایک محدث محض کے رتبہ سے بلند تر ہیں۔

عہدِ نبوی

حیات نبوی میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ تک تھی ان میں سے ۳۰ ہزار خاص مدینہ میں متوطن تھے۔ اور باقی ادھر اُدھر بحرین و یمن، مکہ و طائف وغیرہ بلاد عرب میں پھیلے تھے۔

اصحابِ صفہ

مدینہ سے باہر دوسرے شہروں اور قبیلوں کے لیے یا فقہائے صحابہ جن کا اس زمانہ میں قراء نام تھا، جو اکثر اصحاب صفہ ہوتے تھے بھیجے جاتے تھے، یا ان میں سے ایک دو کو چند روز آنحضرت صلعم اپنی صحبت میں رکھ کر احکام و سنن کی تعلیم دے کر ان کو ان کے شہر و قبیلہ میں واپس فرما دیتے تھے، مدینہ کے اندر خود شارع علیہ السلام کا وجود اقدس کارفرما تھا۔ خود عہد نبوت میں ۳۰ ہزار صحابہؓ مدینہ میں سے ۱۰۰ آدمی مسجد مدینہ کے صفہ (چبوترہ) پر شب و روز طلب علم میں مصروف تھے، آنحضرت صلعم کے بعد ۲۴، ۲۵ برس مدینہ تمام دنیائے اسلام کا مرکز رہا۔ ہر

قسم کے احکام وفتاوی کا فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔ تمام اکابر صحابہ یہیں تشریف فرما رہتے۔

طبقات فقہائے صحابہ

فقیہ ترین صحابہ جن کے فقہ وفتاویٰ واحکام اگر الگ الگ ترتیب دیئے جائیں، تو ایک ایک مستقل جلد تیار ہو جائے، چھ شخص تھے، عمر بن الخطابؓ، علی بن ابی طالب، عبداللہؓ بن مسعود ام المومنین عائشہؓ زیدؓ بن ثابت، عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن عمر۔

ان کے بعد وہ اشخاص ہیں جن کے فتاویٰ واحکام وقضایا ایک ایک رسالہ کے بقدر ہیں۔ اس جماعت میں تقریباً ۲۰۔ اشخاص ہیں۔ ابوبکر صدیق ام المومنین ام سلمہ انس بن مالک، ابوسعید حذری، ابوہریرہؓ عثمان عفان عبداللہؓ بن عمرو بن العاص، عبداللہ ابوموسیٰ اشعری، سعد بن ابی وقاص، سیلمان فارسی، جابر بن عبداللہ۔ معاذ بن جبل، طلحہ زبیرؓ بن العوام عبدالرحمٰن بن عوف، عمران بن حصین۔ ابوبکرہؓ، عبادہ بن صامت، معاویہؓ بن ابی سفیان۔

تیسرا طبقہ ان صحابہ کا ہے، جن کے مجموعی قضایا وفتاوے صرف ایک مختصر رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں[1]۔ ان میں عام صحابہ داخل ہیں۔

صحابہ مدینہ وغیر مدینہ

حضرت علی نے ۴ برس اپنی خلافت کے کوفہ میں بسر کیے ان کے ساتھ سلمان فارسی بھی تھے، اسی طرح فتنہ کے بعد حضرت انسؓ اور ابن مسعودؓ بھی آخر عمر میں کوفہ چلے گئے، حضرت عبداللہ حضرت علیؓ کے عہد میں بصرہ کے والی ہوئے، حضرت ابن زبیرؓ کی خلافت کے زمانہ میں مکہ وطائف میں رہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص اخیر زمانہ میں مصر میں رہتے تھے، امیر معاویہؓ تمام تر شام میں رہے، ان کے علاوہ یہ تمام بزرگوار جن کے نام ہم نے اوپر پہلے اور دوسرے طبقہ میں گنائے ہیں، مدینۃ الرسول ہی میں اپنی تمام عمر بسر کرتے رہے۔

---

[1] یہ تفصیل مقدمہ اعلام الموقعین ابن القیم میں ہے ص ۱۴ مصر

فقہائے تابعین مدینہ

صحابہ کے دَور کے بعد تابعین کا طبقہ ہے۔ تابعین میں محدثین تو سینکڑوں ہیں، جن میں سے اکثر کے نام شیوخ مالک کی فہرست میں گذرے، لیکن فقہا میں مشہور ترین اشخاص خارجہ بن زید بن ثابت، سالم رض بن عبداللہ بن عمر بن خطاب، قاسم بن ابی بکر صدیق، عروہ بن زبیر عبیداللہ بن عتبہ، ابوبکر بن حارث، سلیمان بن یسار، ابوسلمہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن ابوبکر بن عمرو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز، سعید بن المسیب ہیں۔ ان بزرگوں کا مدینہ میں بیک وقت اجتماع تھا۔ ہر قسم کے قضیئے، احکام اور فتوے ان ہی بزرگوں کی مخصوص مجلس میں طے پاتے تھے[1] حضرت عمر بن عبدالعزیز جب مدینہ کے والی مقرر ہوئے تو انہوں نے اس مجلس کو اور باقاعدہ کر دیا، عروہ بن زبیر، عبیداللہ بن عتبہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ابوبکر بن سلیمان، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ کو بلا کر اپنی مجلس کے ارکان شوریٰ مقرر کیے[2] تمام احکام و مقدمات ان حجوں کی بحث و مذاکرہ کے بعد طے ہوتے تھے، اور وہ مدینہ کی عدالت کا حکم فقہی تسلیم ہوتا تھا۔ جس میں زیادہ مدد حضرت عمر کے قضایا و احکام سے لی جاتی تھی۔ کہ ان کے عہد حکومت میں وسعتِ فتوحات نے بہت سی نئی ضرورتیں پیدا کر دی تھیں۔ حضرت عمر ان کا فیصلہ فقہائے صحابہ کی مجلس میں اور ان کے نواسہ عمر بن عبدالعزیز کی زیر صدارت تابعین کی مجلس میں مرتب ہو چکا تھا۔

فقہ مالک

امام مالک کے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد اسی فقہ مدینہ پر ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں لکھا ہے "امام مالک بنائے فقہ را بر حدیث آنحضرت صلعم نہادہ است کہ مسند باشد یا مرسل ثقاۃ، بعد ازاں بر قضایائے عمر و بن عبدالعزیز" موطا کے طرز استدلال اور احادیث و آثار کا جس نے بغور و دقت نظر مطالعہ کیا ہے وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا۔ کہ امام مالک کی فقہ و فتاوی کی یہی بنیاد و اصول

[1] فتح المغیث صفحہ ۱۳۹۹ ہند [2] اخبار الطعال ابوحنیفہ دینوری صفحہ ۱۳۳ ۱۳۱، مصر

ہیں اور انہی اصول پر امام مالک فتاوے[1] فقیہہ کا جواب دیتے تھے۔

امام مالک کے فضل و کمال کا تمام شیوخ مدینہ کو اعتراف تھا۔ تاہم مالک نے اس قدر احتیاط کی کہ جب تک ستر علمائے عظام نے امام صاحب کی قابلیت و استحقاق کا فتویٰ نہ دیا، امام صاحب نے اس مرتبہ عالی پر قدم رکھنے کی ہمت نہ کی عادت مبارک ہمیشہ یہ جاری رہی کہ جب کسی فتوے کا جواب ارشاد فرماتے تو پہلے ماشاء اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے[2]۔

حکومت کا اعلان

نہ صرف مدینہ و حجاز بلکہ اطرافِ ملک سے سائلین کا اژدحام رہتا تھا، موسم حج جبکہ تمام دنیائے اسلام کو ایک عرصہ عرفات میں جمع کر دیتا تھا، اور تمام علماء دین، کوفہ، بصرہ، خراسان وغیرہ سے سمٹ سمٹ کر ایک حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے، تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا امام مالک اور ابن ابی ذئب کے سوا اور کوئی فتویٰ نہ دے

حکومت کے مقابلہ میں آزادی فتویٰ اطلاق مکرہ

حکومت کی اس تعظیم و تکریم کا نتیجہ شاید دوسروں پر یہ ہوتا کہ وہ کم از کم مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے کے خلاف، حکومت کے مشورہ کی تعمیل کرتے، لیکن امام صاحب اپنی حریت رائے اور اعلانِ حق میں اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اس نے ڈر کر بجبر و اکراہ دے دی تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی۔ لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو گی۔ والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی جو خلیفہ منصور کا چچا زاد بھائی بھی تھا، اس نے امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں، لیکن امام صاحب نے

---

[1] تزئین الممالک عن نعیم صفحہ ۸، [2] ابن خلکان ترجمہ مالک

علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لیے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔

لاادری

یہ اعلانِ اور حریت رائے تو حکومت کے مقابلہ میں ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ شدید موقع اعلانِ حق کا اپنے نفس کے مقابلہ میں ہے، مفتی کے لیے جس قدر پہلی قسم کی حریت کی حاجت ہے، اس سے زیادہ دوسری قسم کی حریت کی ضرورت ہے، لیکن امام صاحب جس طرح پہلی منزل میں مستقیم تھے۔ دوسری منزل میں بھی درماندہ نہ تھے۔ امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزئیہ پر اطلاع نہ ہوتی، تو نہایت متانت وکشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے کہ لاادری میں نہیں جانتا، امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر میں امام مالک کی لاادری لکھا کرتا تو کتنی تختیاں بھر جاتیں[1]۔

ممالک بعیدہ کے استفتا سے احتراز

اکثر دور کے شہروں سے جو مستفتی آتے تھے۔ امام صاحب حتی الوسع ان کو جواب دینے سے احتراز کرتے۔ ابن عبداللہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور ودراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے فرمایا کہ میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا"۔ سائل نے کہا کہ میں چھ مہینے کی راہ طے کر کے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں، جن لوگوں نے مجھ کو بھیجا ہے، میں ان کو جا کر کیا جواب دوں گا"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ مالک نے کہا کہ میں نہیں جواب دے سکتا"۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ابونعیم نے حلیہ میں بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے فتویٰ پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ میں اچھی طرح نہیں بتا سکتا" اس نے کہا کہ میں اتنے دور دراز راستہ سے اسی لیے آیا ہوں"۔ امام

---

[1] تزیینُ الممالک ص ۱۴ عن ابی نعیم

صاحب نے فرمایا کہ "جب اپنے گھر پہنچو تو کہہ دینا کہ مالک کہتے ہیں کہ میں اچھی طرح نہیں بتا سکتا"۔

ایک اور واقعہ ابونعیم نے امام کے شاگرد عبدالرحمٰن بن مہدی کی زبانی نقل کیا ہے کہ ایک شخص چند روز تک ایک فتوے کے جواب کے لیے حاضر خدمت ہوا کیا۔ ایک دن اس نے عرض کیا کہ میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا، جو کچھ جواب ہو ارشاد فرمایئے یہ سن کر آپ نے سر جھکا لیا، تھوڑی دیر کے بعد سر اُٹھا کر فرمایا کہ میں اسی مسئلہ کا جواب دیتا ہوں، جس میں کچھ بہتری جانتا ہوں۔ تمہارے اس مسئلہ کو میں اچھی طرح نہیں جانتا

امام صاحب کا یہ احتراز درحقیقت شدت تقویٰ اور ایک نہایت دقیق نکتہ پر مبنی تھا مفتی کی حالت یہ ہے کہ آج وہ ایک مسئلہ کی نسبت ایک رائے رکھتا ہے۔ دوسرے دن اس سے صحیح تر اسی کے خیال میں آتی ہے۔ ایسے موقع پر شہر اور اس کے قرب و جوار میں مستفتی کو اپنی غلطی سے اطلاع دے سکتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں جب وسائل سفر و خبر آسان نہ تھے، ممالک بعید میں تصحیح و تغلیط کی اطلاع مشکل تھی امام صاحب کے ایک مصری دوست نے حیرت سے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ ان بیچاروں کو جو کوسوں سے مصائب سفر و مصارف راہ برداشت کر کے آتے ہیں۔ کیوں واپس کر دیتے ہیں؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ مصری مصر سے شامی شام سے، عراقی عراق سے آتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں۔ شاید جو جواب میں نے آج دیا ہے، اس کی بجائے کل مجھ کو کچھ اور جواب معلوم ہو"۔ حضرت لیث مصری نے جب امام کا یہ قول سنا تو رو پڑے کہ مالک لیث سے قوی تر ہے۔ اور لیث ان سے کم زور تر فتووں کے جواب میں اکثر یہ فرماتے تھے کہ قال رسول اللّٰہ کذا آنحضرت صلعم نے یہ فرمایا ہے۔ سائل نے کہا کہ آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ آیت پڑھی: فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ اَنْ

لَصِیْبَہُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ[1] جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان فرماتے تو پہلے یہ آیت پڑھ دیتے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ[2]

جواب میں کاوش و فکر

مسائل و فتاویٰ کا جواب ہمیشہ دقتِ نظر اور کاوش فکر سے دیتے تھے۔ ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آجاتا ہے کہ خواب و خور حرام ہوجاتا ہے۔ ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے، پھر آپ یہ کیوں مشقت برداشت کرتے ہیں، امام کس نکتہ سنجی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ ابن ابی اویس اس حال میں تو مجھ کو اور بھی کاوش کرنی چاہیئے[3]۔

انصاف پسندی

اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہوتی اور کوئی اصلاح کر دیتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے، ایک شخص نے پوچھا، کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں تخلیل کرنی چاہیئے؟ امام نے فرمایا لیس ذالک علی الناس ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے، مجلس کے بعد انہوں نے کہا کہ تخلیل کی حدیث ایک میرے پاس ہے، امام نے سن کر کہا کہ "حدیث حسن" اور اس کے بعد پھر ہمیشہ فتویٰ اسی کے موافق دیا[4]۔ امام مالک تقریباً ۶۰ برس متصل فقہ و فتاویٰ میں مصروف

---

[1] تزئین الممالک عن ابی نعیم صفحہ ۱۴۱۔

[2] مناقب مالک الزاوی صفحہ ۱۳۹ عن سعید بن سلیمان۔

[3] الزواوی عن الرحمن بن عبدالعزیز العمری صفحہ ۱۳۱۔

[4] الزواوی عن ابن وہب صفحہ ۱۳۰۔

رہے امام کے تلامذہ نے امام کے مسائل فقہیہ وفتاوے کو مدون بھی کیا ہے، سب سے پہلی کتاب اسد بن الفرات قاضی افریقہ کی "اسدیہ" ہے اور سب سے ضخیم ابن قاسم المتوفی سنہ ۱۹۱ کی "المدونتہ" ہے، جو خود امام کی زندگی میں مدون ہو رہی تھی۔ مدونہ مصر میں اب چھپ گئی ہے۔ تیسری کتاب ابن وہب مصری المتوفی سنہ ۱۹۷ کی کتاب المجالسات عن مالک ہے، ان کتابوں میں امام کے ہزاروں فتاوے مدون ہیں۔ ابن قاسم مصنف مدوّنہ کی نسبت مشہور ہے کہ ان کو امام کے ۴۰ ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔

امام صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف

دنیا میں ماہر فن کا اعتراف اگر فضیلت کا کوئی معیار ہے تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس معیار کی بنا پر امام مالک کا پایہ نہایت بلند ہے، امام مالک ارباب رائے میں داخل ہیں محدثین نے ارباب رائے کا کم اعتراف کیا ہے۔ لیکن امام مالک باوجود انتساب رائے محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں۔ جو صاحب فن اپنے اتباع اور مقلدین میں رکھتا ہے، یحیٰی بن معین جو حدیث و رجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں، مالک امیر المومنین فی الحدیث "مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں"۔ محدث کبیر سفیان بن عیینہ کہتے تھے، ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں! ہم لوگ تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر امام مالک نے کسی شیخ سے روایت کی ہے، تو اس سے کرتے ہیں، ورنہ چھوڑ دیتے ہیں"۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث نبوی کا کوئی امانت دار نہیں"۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے، حدیث آئے تو مالک ستارہ ہیں"۔ محدث ابن نہیک کا قول ہے کہ صحت حدیث میں، میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا"۔ امام احمد ابن حنبل سے ایک شخص نے پوچھا۔ کہ اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنا چاہے تو کس کی کرے"؟ جواب دیا کہ مالک بن انس کی، ابن مہدی جو نہایت مشہور محدث ہیں۔ ان سے ایک شخص نے کہا کہ "میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے کہ مالک ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہیں"۔ انہوں نے فرمایا میں نے تو یہ نہیں کہا لیکن یہ کہتا ہوں کہ مالک ابوحنیفہ کے استاد (حماد) سے بھی زیادہ فقیہ ہیں"۔ ظاہر ہے یہ مبالغہ ہے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ امام مالک اور دوسرے ائمہ سے زیادہ فقیہ تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی فقہ عالم اسلام کے بیشتر حصہ میں رائج ہے۔

سفیان بن عیینہ باایں ہمہ علم وفضل حلال وحرام اور حدیث معمول کا املاء امام مالک کے حلقہ میں بیٹھ کر سنتے تھے۔ اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مستفیدین کے حلقہ میں بیٹھتے تھے۔ سفیان ثوری جو مجتہد مستقل ہیں، وہ مناسک حج میں امام کی پیروی کرتے تھے، ابن معین جو نقد حدیث میں امام ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اصحاب زہری میں مالک سے بڑھ کر کوئی اثبت نہیں"۔ ابن معین کا دوسرا قول ہے۔ کان مالکؒ من حجج اللہ علی خلقہ" یعنی" مالک خدا کی طرف سے خلق پر ایک حجت تھے" یحییٰ بن سعید القطان جو امام حدیث ہیں فرماتے ہیں، کہ مالک اس امت کے لئے رحمت تھے"۔ ابن ابی حازم نے ناقد حدیث اور آوردی سے پوچھا کہ اس خدائے کعبہ کی قسم! مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا؟ جواب دیا کہ" خدایا نہیں"۔

شغل حیات، شخصیت اور عظمت

اب ہم مجلس درس و افادہ سے اُٹھ کر دربار شاہی میں آتے ہیں۔ امام صاحب ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور یہ وہ زمانہ تھا، کہ ولید سریر آرائے خلافت دمشق تھا۔ لیکن ۲۵ برس بعد ۱۱۷ھ میں جب امام تعلیم سے فارغ ہو کر شہرت عام حاصل کر رہے تھے، تو خلافت امویہ دمشق کا دم باز پسین تھا، یہ ہشام بن عبد الملک کا عہد اخیر تھا، ۱۲۵ھ میں اس نے وفات پائی۔ اس کے بعد ۸ برس کی مدت میں ولید بن ولید ابراہیم بن ولید اور مروان بن محمد بن مروان چار بد قسمت بادشاہوں کے اوراقِ حکومت جلد جلد اُلٹ گئے، تا آنکہ ۱۳۳ھ میں خلافتِ عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔

خلافتِ عباسیہ

خلافتِ عباسیہ کا پہلا تاجدار ابو العباس سفاح ہے اس کا زمانہ خلافت ساڑھے چار برس ہے، جو صرف عہد جدید کے انتظام و تدابیر اور خانہ جنگیوں میں صرف ہو گیا، اس کی خلافت کے اخیر سال ۱۳۶ھ میں اس کا بھائی ابو جعفر منصور سالارِ حجاج بن کر حجاز گیا۔ اور آخر اسی سفر مبارک کی واپسی میں مژدۂ خلافت اس کے گوش گذار ہوا۔ لیکن حقیقت میں ۱۳۸ھ تک یعنی جب تک ابو مسلم خراسانی قتل نہ ہوا، وہ خلیفہ نہ تھا، ۱۳۹ھ میں بغداد تعمیر ہوا اور بغداد کے سنگِ بنیاد کے ساتھ عباسیہ کی حکومت کی بنیاد بھی اس نے ایک مضبوط چٹان پر قائم کی، ان کاموں سے فراغت پا کر ۱۴۰ھ میں حج و زیارت کے لیے مکہ معظمہ

اور مدینہ منورہ آیا۔[لہ]

خانوادہ خلافتِ عباسیہ جواب اوجِ کمال پر تھا۔ چند سال پہلے صرف شرفائے قریش کا ایک گھرانا تھا، اس لیے منصور طلبِ علم، اساتذہ کی صحبت، علمی مجلسوں کی نشست میں اسی طرح برابر کا شریک تھا۔ جس طرح دیگر اشراف وسادات کے خاندانوں کے ہونہار بچے، منصور اس انقلاب سے پہلے مدینہ کی درسگاہ کا ایک طالب العلم اور امام مالک کے طبقہ کا ایک شریک صحبت تھا۔

خلافت کے بعد منصور کے لئے حج کا یہ پہلا موقع تھا۔ شہر کے شرفا اور علما اس کے استقبال کے لیے نکلے، سفیان ثوری، سلیمان خواص اور امام مالک بھی ملنے کے لیے آئے کہ کل تک تو علم حدیث کی مجلسوں میں ہمارے ساتھ یہ برابر کا شریک تھا۔ دیکھیں اب وہ کس حال میں ہے۔ دربار میں حجاز کے تمام علماء اور فقہا موجود تھے۔ منصور نے امام صاحب کی طرف روئے خطاب کر کے کہا اے ابوعبداللہ (امام صاحب کی کنیت) میں اختلافات فقہی سے گھبرا گیا ہوں عراق میں تو کچھ نہیں ہے۔ شام میں صرف جہاد کا شوق ہے وہاں کوئی بڑا علم نہیں۔ جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علماء کے سرخیل آپ

[لہ] امام مالک اور خلیفہ منصور کے متعلق تاریخ ومناقب کی کتابوں میں بہت سے منتشر و پراگندہ اور متضاد الفاظ وعبارت کے واقعات مذکور ہیں۔ جن میں باہم کوئی ترتیب تاریخ بھی نہیں۔ ہم ان کو یہاں بہ اجمال وتلخیص ذکر کرتے ہیں۔ اتنا معلوم ہے۔ کہ یہ تمام واقعات موسم حج کے اجتماع میں پیش آتے تھے۔ کتب تاریخ سے منصور کے سفر حج کی تاریخیں ثابت ہیں۔ ایک سنہ ۱۳۹ھ میں قبل خلافت اس کا تو شمار نہیں، خلافت کے بعد تین دفعہ اس نے سفر حج کیے ہیں۔ پہلا سنہ ۱۴۰ھ میں دوسرا سنہ ۱۴۴ھ میں اور تیسرا سنہ ۱۵۸ھ میں۔ اسی تیسرے سفر حج میں حج سے پیشتر ۶ ذوالحجہ کو منصور نے انتقال کیا (اخبار الطوال) ابن حنیفہ دینوری المتوفی سنہ ۲۸۱ھ طبع مصر صفحہ نمبر ۳۵۷، ۳۶۴ غالباً یہ تمام ان ہی موقعوں کے ہیں۔

ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس تصنیف (موطا) کو خانۂ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ممالکت میں اس کی نقلیں بھیجوں۔ تاکہ اسی کے مطابق لوگ فتوے دیں"۔ بعض روایتوں میں ہے۔ کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی تالیف کی خواہش ظاہر کی۔ جو ابن عباسؓ اور ابن مسعود و ابن عمرؓ کے اصولِ فقہ کے بین بین اور معتدل ہو۔ اس کے بعد امام صاحب نے موطا تالیف کی۔

امام کا انکار

بہرحال جاہ پسند علماء کے لیے یہ وہ طلائی موقع تھا۔ کہ جس سے زیادہ کوئی بیش قیمت ان کو کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن امام صاحب کے لیے یہ بھی لغزشِ قدم کا باعث نہ ہوا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ صحابہ تمام اطرافِ ملک میں پھیل گئے تھے۔ ان کے فتاوے اور احکام اپنے اپنے مقام میں وراثتہً ان کے فقہا اور علماء تک پہنچے ہیں۔ اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں۔ ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے وعقل پر جو صحت و غلطی دونوں کر سکتا ہے تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں"۔ منصور نے کہا" اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا[1]۔

ایک بار اس نے پوچھا کہ اے ابوعبداللہ! تم سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے"؟ امام نے فرمایا" ہاں" پوچھا" وہ کون ہے" فرمایا ان کے نام یاد نہیں"۔ منصور نے کہا" میں بنو اُمیّہ کے زمانہ میں طلب علم کر چکا ہوں۔ سب کو جانتا ہوں[2]"۔

امام مالک کے فضل و کمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیچھے بھی کرتا تھا۔ سفیان ثوری اور سلیمان خواص ایک بار منصور سے ملنے گئے۔ منصور نے خیمہ کے اندر بلایا۔ سفیان توری نے کہا کہ یہ فرش جب تک اٹھایا نہ جائے میں نہیں آ سکتا۔ فرش اٹھ گیا تو آیت مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى" اُسی خاک سے تم کو پیدا کیا اور اسی خاک سے تم کو اٹھائیں گے"۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ج ۱ صفحہ ۱۸۹، کتاب الامامہ ابن قتیبہ ج ۲ صفحہ ۱۷۲۔ مناقب مالک للزوادی صفحہ ۲۴۴، باختلاف عبارت

[2] مناقب للزوادی ۲۴۴۔ عن ابی حاتم۔

پڑھتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے، منصور آبدیدہ ہوگیا سفیان ثوری دیر تک بالفاظ سخت نصیحت کرتے رہے، پھر اٹھ کر چلے آئے، ابوعبیدہ جو دربار کا ایک عہدہ دار تھا اس نے کہا "امیر المومنین ایسے زبان دراز شخص کے قتل کا حکم کیوں نہیں دیتے"۔ منصور نے کہا "خاموش! سفیان ثوری اور مالک بن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔

شاید یہ واقعہ تاریخی آپ کو معلوم ہو کہ حضرت علی کے بعد ہاشمیوں کے مقابلہ میں جب بنو امیہ نے نمایاں کامیابی حاصل کر لی، تو بنو ہاشم نے جن میں بنو عباس بنو فاطمہ اور عام علویین داخل تھے، سب مل کر ایک خلافتِ ہاشمیہ کے قیام کی مخفی کوششوں میں مشغول ہوگئے۔ اولاً کوششوں کا مرکز امامت خاندان فاطمی و علوی تھا، امام حسینؑ کے بعد محمد بن حنفیہ حضرت علی کے غیر فاطمی صاحبزادے امام ہوئے ان کے بعد ابوہاشم عبداللہ علوی، ابوہاشم کا حمیمہ واقع شام میں انتقال ہوگیا۔ وہاں محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ کوئی ہاشمی موجود نہ تھا۔

اس لیے ابوہاشم نے اپنی جانشینی کی وصیت محمد عباس کے حق میں کی یہ پہلا دن ہے کہ خلافت کا ادعا خاندانِ علوی سے منتقل ہو کر خاندان عباسی میں آتا ہے۔

محمد بن علی عباسی نے ۱۲۴ھ میں وفات پائی اور ان کی جگہ ان کے بیٹے ابراہیم بن محمد عباسی امام تسلیم ہوئے، ابراہیم، مروان اموی کے ہاتھ گرفتار ہو کر مر گئے یا مارے گئے، شیعہ عباسیین نے اس غم میں سیاہ کپڑے پہنے اور اس وقت سے سیاہ رنگ عباسیوں کا نشان ہوگیا۔ ابراہیم کے بعد ابوالعباس سفاح بنو ہاشم کا سرخیل ہوا، آخر ۱۳۲ھ میں اس کو کوششوں نے کامیاب کیا، سفاح نے کامیابی کے بعد حق خلافت بنو ہاشم میں سے صرف بنو عباس کے ساتھ مخصوص کر دیا۔

ایک طرف تو نئے تاجدار امویوں کے استیصال میں ان کی قبروں کی ہڈیاں تک اکھاڑ رہے تھے اور اموی و مروانی چن چن کر جہاں ملتے تھے مارے جا رہے تھے، خراسان

کی وحشی سپاہ، صوبوں کی تسخیر اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں جا و بیجا ہر قسم کے امور کا تمام ملک میں ارتکاب کر رہی تھی، دوسری طرف تخصیصِ خلافت سے فاطمیوں اور علویوں میں ناراضی پیدا ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کو قسمت کے ان مالکوں سے جس امن و صلح و انصاف کی توقع تھی پوری نہ ہوئی، تاہم سفاح تک عملاً کوئی ناراضی ظاہر نہ ہوئی لیکن منصور نے احتیاط یا سوءِ ظن کی بنا پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی، آخر تنگ آ کر انہی سادات میں سے ۱۳۵ھ میں نفس زکیہ نے مدینہ میں علمِ بغاوت بلند کیا، اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی، بڑی بہادری سے میدان جنگ میں لڑ کر مارے گئے ان کے بھائی ابراہیم اس سر و سامان سے نکلے کہ منصور بدحواس ہو گیا، چند مہینوں کے بعد ابراہیم کی شہادت پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا، منصور نے اپنے عم زاد بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

امام مالک منصور کی ملاطفتوں کے باوجود ان تمام کوششوں میں حق کے ساتھ تھے امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے"۔ لوگوں نے پوچھا کہ ہم منصور کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں، امام صاحب نے فرمایا "منصور[له] نے جبراً بیعت لی ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے، شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث ہے کہ اگر جبراً کسی سے طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی"۔

جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی، امام مالک کو کہلا بھیجا کہ آئندہ طلاق جبری (مکرہ) کے عدم اعتبار کا فتوےٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لیے سند ہاتھ آئے، امام سے ترک حق کی توقع کس قدر بیجا خواہش تھی، امام صاحب بدستور معاملۂ جبری کے عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے، سلیمان نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ ان کو ستر کوڑے مارے جائیں، امام

[له] ان واقعات کیلیے دیکھو کتاب الامامہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۲، ابن خلدون جلد ۳، صفحہ ۱۹۰

دار الہجرۃ کو محکمۂ امارت میں گنہگاروں کی طرح لایا گیا۔ کپڑے اتارے گئے اور شانۂ امامت پر دستِ ظلم نے ستر کوڑے پورے کیے۔ تمام پیٹھ خون آلودہ ہوگئی۔ دو ہاتھ مونڈھے سے اُتر گئے۔ اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے۔ امام صاحب بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گذر رہے تھے۔ اور زبانِ صداقت نشان بآواز بلند کہہ رہی تھی "جو مجھ کو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں"[1]

اس کے بعد اسی طرح خون آلود کپڑوں کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف لائے پشتِ مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور لوگوں سے فرمایا کہ سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انہوں نے بھی مسجد میں آکر نماز پڑھی تھی[2]۔ یہ تعزیر گو تحقیر کے لیے تھی، لیکن اس نے امام کی عزت و وقار کے پایہ کو اور بلند کر دیا یہ واقعہ ۱۴۶ھ کا ہے[3]۔

منصور کی لاعلمی اور ندامت

بقول ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ وہ کتاب الامامۃ کا مصنف ہے) جعفر والیٔ مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی اور فوراً اس کو معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالک کو معذرت کا خط لکھا۔

دوسرے سال ۱۵۰ھ میں جبکہ تمام حجاز و عراق میں سکون ہو چکا تو حج کے ارادہ سے منصور حجاز آیا۔ امام مالک ملنے کو آئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ حج سے پہلے خود امام کو بغداد بلایا۔ گئے تو نہایت تعظیم سے ملا۔ اور بوثوق کہا کہ "نہ میں نے تعزیہ کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی"۔ اس

---

[1] طبقات ابن سعد ترجمہ مالک، مناقب مالک للزوادی۔ [2] تزئین الممالک نقلاً عن الخطیب روایۃً عن ابی وہب صفحہ ۱۳ [3] کتاب للسمعانی ترجمہ اصبحی۔

تمہید کے بعد منصور نے سلسلۂ تقریر اس طرح شروع کیا۔

منصور کی تقریر

اے ابوعبداللہ! جب تک آپ زندہ ہیں، آپ اہلِ حرمین کے ملجا و ماویٰ ہیں، جن مصائب کا ان کو نشانہ بننا چاہیے، صرف آپ کی ذات سے وہ ان سے محفوظ ہیں مجھ کو جہاں تک علم ہے۔ ان دونوں مقامات کے باشندے نہایت فتنہ جو ہیں۔ اور پھر ان میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ استقلال سے مقابلہ کر سکیں، میں نے دشمنِ خدا (جعفر) کی نسبت حکم دیا ہے، کہ وہ مدینہ سے بغداد گدھے پر سوار ہو کر جائے اور اس کو ذلت و ایذا پہنچائی جائے۔

امام صاحب نے فرمایا "اس انتقام کی حاجت نہیں۔ امیر المومنین اور پیغمبر خدا صلعم کی قرابت کی خاطر میں اس کو معاف کرتا ہوں[1]"، منصور نے خلعت پیش کیا، قاعدہ تھا کہ خلعت کے کپڑے درباری کے کندھے پر رکھ دیے جاتے تھے، حاجب نے یہی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا۔ امام صاحب پیچھے ہٹ گئے، منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو ابوعبداللہ کے فرودگاہ میں پہنچا دو"۔

منصور کی زبان سے تعزیہ کا سبب

اس سوال و جواب اور تعظیم کے الفاظ کو چھوڑ کر منصور کے الفاظ دوبارہ پڑھو، نظر آئے گا کہ امام مالک کی تعزیہ کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ اہلِ حرمین بغاوت پسند ہیں اور آپ حرمین کے مقتدیٰ اور امام ہیں۔ اس لیے بغیر آپ کے اشارہ کے یہ باتیں نہیں ہوئیں۔ اور منصور کی ستم ظریفی دیکھو کہ باوجود اس علم کے کہ امام سادات کے طرفدار ہیں، مدینہ میں جو سادات جرم بغاوت میں قید تھے، ان کے پاس اپنی طرف سے خود امام مالک کو سفیر بنا کر بھیجا[2]۔

---

[1] کتاب الامۃ ج ۲ صفحہ ۲۹۰ تا ۲۹۷ [2] کتاب العبر ابن خلدون ج ۳ صفحہ ۱۸۹۔

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علماء کو میری حکومت سے ناراضی ہے، اس نے خلافِ وقت شب کو ابن ابی ذئب و ابن سمعان فقہائے حجاز اور امام مالک کو طلب کیا۔ امام صاحب واقعہ سمجھ گئے زندگی سے ناامید ہو کر غسل فرما کر کفن کے کپڑے پہن کر اور حنوط (مُردوں کو لگایا جاتا ہے) مل کر دربار آئے۔ منصور نے کہا اے گروہ فقہا، مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے۔ جس سے افسوس ہے حالانکہ تمہارا فرض تھا کہ سب سے پہلے تم میری اطاعت کرتے اور مجھ کو بُرا کہنے سے باز رہتے، اگر مجھ میں کچھ عیب ہوتا تو تم مجھ کو نصیحت کرتے"۔

امام صاحب نے فرمایا کہ اے امیر المومنین خدائے پاک ارشاد فرماتا ہے' یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ۔

مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو کچھ خبر دے تو اس کی تحقیق کر لو' ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں بے گناہوں کو ستاؤ، پھر اپنے کیے پر تم کو ندامت ہو"۔

منصور کی نسبت اظہارِ رائے سے انکار

منصور نے کہا اچھا بتاؤ کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں۔ امام نے فرمایا للہ مجھے اس کے جواب دینے سے معاف کرو" منصور نے ابن سمعان کی طرف رُخ کیا کہ تم بتاؤ میں کیسا ہوں"۔ ابن سمعان بولے" امیر المومنین' آپ سب سے بہتر ہیں' حج کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، مظلوموں کی امداد کرتے ہیں' اسلام کی پشت پناہ ہیں۔ عادل ہیں" اب منصور نے ابن ابی اذئب سے پوچھا کہ ابن ابی ذئب! تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو"۔ ابن ابی ذئب نے دلیری سے کہا۔ تم بدترین مخلوق ہو۔ مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان و شوکت میں صرف کرتے ہو۔ غریبوں کو ہلاک اور امیروں کو پریشان کر ڈالا۔ بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے"۔ منصور نے کہا" تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے"۔ ابن ابی ذئب نے کہا ہاں ننگی تلواریں دیکھتا ہوں۔ لیکن آج کی موت کل کی موت

سے بہتر ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمعان اور ابن ابی ذئب اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن امام تشریف فرما رہے۔ منصور نے کہا مجھے آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے، امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت طلب سے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر آیا تھا، منصور نے کہا "سبحان اللہ ابو عبداللہ کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا"[1]

محمد المہدی

اسی سفر حج سے پہلے ۶ ذالحجہ ۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اُس کا جانشین ہوا دو سال کے بعد ۱۶۰ھ میں مہدی مع شہزادگان خلافت، موسیٰ ہارون، حج کے ارادہ سے عازم حجاز ہوا، حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا۔ شہر کے قریب پہنچا تو شرفاء و علمائے شہر نے استقبال کیا۔ جن میں امام مالک بھی داخل تھے۔ مہدی نے امام کو دیکھا تو ادھر توجہ کی اور سلام کر کے سینہ سے لگا لیا۔ اس سال حجاز میں سخت قحط تھا امام نے فرمایا امیر المومنین اس وقت آپ جس شہر میں جا رہے ہیں وہاں مہاجرین و انصار کی اولاد آباد ہے۔ وہ روضۂ نبوی کے ہمسایہ ہیں۔ مہدی امام کا مقصود سمجھ گیا اور ۲۵ لاکھ درم امام کے پاس بھیج دیئے کہ تقسیم کر دیجیے، امام صاحب نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں[1]۔

تین ہزار دینار اپنے حاجب اعظم ربیع کے ساتھ امام کی خدمت میں بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بغداد میرے ساتھ چلیں، امام صاحب نے قاصد سے کہا، "تھیلیاں اب تک سربستہ اسی طرح پڑی ہیں۔ جی چاہے لے جاؤ لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ المدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون[2]۔

مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہِ خلافت میں آئیں۔ سواری واپس کر دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کہ انہی گلیوں میں حضرت سرورِ کائنات صلعم

---

[1] کتاب الامام ج ۲ صفحہ ۲۹۰ و مناقب الزوادی صفحہ ۲۷ [2] تذکرہ ذہبی جلد ۱ صفحہ ۱۸۹

پھرتے تھے۔ پیادہ آئے بیمار تھے۔ اس لیے بعض مشاہیر علمائے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے، مہدی نے کہا سبحان اللہ! اگر میں یہ خدمت ان سے لینا چاہتا تو شاید ان میں سے کوئی قبول نہ کرتا۔ مغیرہ نے کہا "امیرالمومنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں وہ اس کے لیے شرف ہے"۔[1]

مہدی نے کہا ایک ایسی کتاب تالیف فرمایئے کہ تمام مسلمانوں کو میں اس کے عمل پہ مجبور کروں، امام مالک نے افریقہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس حصہ کی تکلیف سے تو میں نے تم کو بچالیا۔ شام میں ایک شخص (امام اوزاعی) موجود ہے۔ اور اہل عراق تو اہل عراق ہیں[2]۔

قرأت سے انکار

مہدی نے اسی سفر میں مؤطا کی سماعت حاصل کی۔ بلکہ بعض روائیتوں میں ہے کہ مہدی ہی کے لیے امام نے مؤطا لکھی، گو یہ صحیح نہیں، مہدی نے موسیٰ و ہارون اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ امام سے مؤطا سنیں، شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا۔ امام صاحب نے فرمایا۔ علم بیش قیمت شے ہے، اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں"۔ مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے، شہزادوں کے اتالیق نے کہا۔ پڑھ کر سنایئے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے علماء کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں، شیوخ سنیں، مہدی کو خبر دی گئی، اس نے کہا کہ ان علماء کی اقتداء کرو۔ اور تم خود پڑھو۔ چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی[3]

الہادی

مہدی نے سنہ ۱۶۹ھ میں وفات پائی اور اس کی جگہ موسیٰ ملقب بہ ہادی جانشین ہوا۔ موسیٰ کی خلافت کا زمانہ ایک برس ہے۔ زمانہ شہزادگی کے

---

[1] زوادی عن ابی مصعب صفحہ ۱۲۸۔ [2] زوادادی عن ابراہیم بن حمادی الزہری صفحہ ۱۲۷۔

[3] تزیین الممالک عن فضائل مالک لابن فہر، صفحہ ۱۴۵۔

سوا پھر امام سے اس کو شرف اندوزی کا موقع نہ ملا۔

ہارون الرشید

ہادی کے بعد ۱۷۰ھ میں مسند آلِ عباس پر وہ فرماں روا جلوہ نما ہوا۔ جس کی نسبت شاعر کہتا ہے۔

فمن یطلب لقاءك او یردہ ‌ ‌ ‌ ‌ فبالحرمین اواقصی الثغور
اے ہارون جو تیری ملاقات کا طالب ہو ‌ ‌ ‌ ‌ تو اس کو حرمین میں تو ملے گا یا دشمنوں کی سرحد پر
ففی ارض العدو علی طمرّ ‌ ‌ ‌ ‌ وفی الارض السبویة فوق کور
اے ہارون جو تیری ملاقات کا طالب ہو ‌ ‌ ‌ ‌ اور ارضِ حرم میں محمل پہ

اس وقت امام مالک کی تصنیفات تمام ملک میں پھیل چکی تھیں، خلافت کے پہلے ہی سال حج و زیارت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ آیا۔ لوگ پیادہ استقبال و تہنیت کے لیے نکلے امام صاحب بھی محمل میں سوار ہو کر آئے۔ ہارون الرشید نے امام کو دیکھ کر نہایت خوشی ظاہر کی اور کہا کہ "آپ کی تصنیفات پہنچیں۔ خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ کی تاکید کی ہے۔ لیکن اس کا کیا سبب ہے۔ کہ ہم نے ان میں ابن عباسؓ اور علی ابن ابی طالب کی روائتیں نہیں پائیں؟" امام نے فرمایا کہ "اے امیر المومنین یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے"۔

۱۷۴ھ میں ہارون رشید امین اور ماموں دونوں شہزادوں کو لے کر حج کے لئے آیا۔

ہارون وامین و مامون مجلس درس میں

ہارون رشید نے امام کو مؤطا کو املا کے لیے خود سراپردہ خلافت میں طلب کیا، امام صاحب نے بدستور انکار کیا اور خود مؤطا کے بغیر تشریف لائے، رشید نے شکایت کی امام صاحب نے فرمایا "ہارون رشید! علم تیرے گھر سے نکلا ہے، خواہ اس کو ذلیل کر خواہ عزت دے۔" ہارون رشید متاثر ہوا۔ محمد الامین اور عبد المامون دونوں شہزادوں کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا۔ وہاں طلبہ کا عام ہجوم تھا، ہارون رشید نے کہا "اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔" امام نے فرمایا "شخصی فائدہ کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا" ہارون رشید

مسند پر بیٹھ گیا، امام نے فرمایا امیر المومنین تواضع پسندیدہ ہے"۔ ہارون نیچے اُتر گیا۔

دوسری منزل قرأت وسماعت کی تھی ہارون نے کہا "آپ قرأت کیجیے" امام نے فرمایا "خلاف عادت ہے" یہ کہہ کر معن بن عیسےٰ کو اشارہ کیا، جو ایک مستعد طالب العلم تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے محدثین کے استاد ہوئے۔ انہوں نے قرأت شروع کی، ہاروں نے مع شہزادوں کے سماعت کی۔

مجلس حدیث

اس سفر میں شام وعراق وحجاز کے کل علماء ساتھ تھے، قاضی ابو یوسف بھی اس مجمع میں شریک تھے، ہاروں الرشید نے ان تمام علماء کی ایک مجلس علمی منعقد کی۔ امام صاحب مسندِ تدریس پر رونق افروز ہوئے موطا کا املا شروع ہوا ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہاء محدثین سکوت کی زبان سے صحت کا اعتراف کرتے جاتے تھے۔ فقہی معلومات کا ایک دریا تھا، جو زبانِ امامت سے اُمنڈ اُمنڈ کر سواحل قلوب میں موجیں لے رہا تھا۔

جب مجلس ختم ہوگئی، اور امام صاحب واپس تشریف لے گئے تو ہارون رشید نے حاضرین مجلس کو خطاب کیا۔

"اے فقہائے عراق وحجاز! کیا تم کو ان مسائل میں کچھ کلام ہے جو مالک بن انس نے اس وقت تم کو سنائے ہیں؟" فقہا نے متفقاً جواب دیا کہ "نہیں ہیں ایک مسئلہ کے سوا اور کسی میں کلام نہیں ہے؟" ہارون رشید نے کہا کہ عجب نہیں کہ امام مالک کے اس مسئلہ کا ماخذ قرآن ہو، بہرحال ہارون الرشید نے امام صاحب کو بلا بھیجا۔ امام صاحب تشریف لائے تو ہارون رشید نے کہا "اے ابو عبداللہ! موطا کے ایک مسئلہ سے ان کو اختلاف ہے، آپ اپنے اس مسئلہ کی صحت کی دلیل ان کو بتا دیجئے" ہارون رشید کو امام صاحب کے ساتھ جو خلوص واعتقاد تھا اس کو اس سے اندازہ کرو کہ تمام فقہاء کے مقابلہ میں کہتا ہے: "اور میں بھی اس مسئلہ میں آپ کے ساتھ ہوں"۔ امام صاحب نے قرآن وحدیث

سے اس کے دلائل پیش کیے اور سب نے تسلیم کرلیا۔

اس کے بعد امام صاحب نے ہارون کی طرف خطاب کیا "اے امیرالمومنین جس طرح آپ نے یہاں اس وقت مجھے یاد کیا۔ آپ کے والد نے بھی اسی طرح اور یہیں مجھے یاد کیا تھا۔ اور میں نے ان کو حدیثیں سنائی تھیں" بعد ازاں امام صاحب نے مدینہ کے فقرا اور ستم رسیدوں کی طرف توجہ دلائی، ہارون رشید نے زرکثیر سے فقرائے مدینہ کی امداد کی۔

مسجد نبوی میں ایک منبر تھا جس پر بیٹھ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس منبر پر صرف تین زینے تھے۔ امیر معاویہ نے اس میں چند زینوں کا اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہارون رشید نے چاہا کہ زائد زینے نکال کر پھر منبر نبوی اپنی اصلی حالت پر کر دیا جائے۔ امام صاحب سے مشورہ کیا گیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ ایسا نہ کیجیے کہ اس منبر کی لکڑی کہنہ اور کمزور ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تختوں کے ادھر ادھر کرنے میں ٹوٹ جائے۔ اور اصل سبب یہ ہے کہ وفاتِ نبوی کے وقت مدینہ رسالت کی یادگاروں سے معمور تھا۔ بستر پیالہ۔ عصا۔ موئے مبارک۔ نعلین بہت سی چیزیں مدینہ میں تھیں۔ لیکن آج مدینہ نے ایک ایک کر کے سب کو کھو دیا۔ تاراج شدہ سرمایہ سے صرف ایک ہی منبر رہ گیا، جو بھاری ہونے کے سبب سے مسجد نبوی سے کبھی نکلتا نہیں؟ اگر اس میں کہیں تین زینے کر دیے جائیں گے۔ تو مجھ کو خوف ہے۔ کہ مسجد نبوی کے بدلے بارگاہِ خلافت نہ اس سے مزین ہو، ہارون رشید بھی اس نکتہ کو سمجھ گیا۔ اور اپنے خیال سے باز آیا[1]

ابونعیم نے حلیہ میں خود امام مالک سے روایت کی ہے کہ ہارون رشید نے چاہا۔ کہ موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جائے اور تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی پر مجبور کیا جائے یہ وہ موقع تھا کہ عزت طلب اشخاص کے لیے اس سے زیادہ طلائی

---

[1] کتاب لامۃ السیاسۃ جلد ۲ صفحہ ۲۹۷

موقع ہاتھ نہیں آسکتا، لیکن امام نے جواب دیا "ایسا نہ کرو۔ خود صحابہ فروع میں مختلف ہیں۔ اور وہ ممالک میں پھیل چکے ہیں۔ اور ان میں ہر شخص راہِ صواب پر ہے"۔

ہارون کے نام خط

امام صاحب نے ہارون رشید کی خلافت میں وفات پائی امین و مامون شہزادگی کے عہد میں امام صاحب سے مستفید ہو چکے تھے۔ ہارون رشید کے نام امام کا ایک رسالہ بھی ہے۔ جس میں امام نے ہارون کو نصائح کیے ہیں اور آداب و سنن کی تعلیم دی ہے۔ رسالہ مصر میں سنہ ۱۳۲۲ھ میں چھپ گیا ہے۔

سفرِ آخرت

امام صاحب کی عمر شریف اب ۸۱ برس کو پہنچ چکی تھی۔ نہایت ضعیف اور ناتواں ہو گئے تھے، مسجد نبوی میں آنا، نماز جماعت میں شریک ہونا، اور اِدھر اُدھر غم و شادی کی تقریبوں میں آنا جانا تو پہلے سے ترک ہو گیا تھا۔ لوگ اعتراضات کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ "ہر شخص اپنا عذر نہیں بیان کر سکتا۔" معن بن عیسیٰ المتوفی ۱۹۸ھ جو امام کے عزیز ترین شاگرد تھے، اور جو صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں، وہ اس وقت امام کے خادم تھے، امام صاحب انہی کا سہارا پکڑ کر چلتے تھے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے عالم میں بھی درس و افتا کی خدمت جاری تھی۔ یحییٰ بن یحییٰ اندلسی مصمودی امام اندلس جب دوسری بار مصر سے لوٹ کر مدینہ آئے۔ سند لینے کے لیے آئے تھے تو امام صاحب بستر مرض الموت پر تھے۔

اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ تک بیمار رہے۔ مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ لوگوں کو یقین ہو گیا۔ کہ اب وقتِ آخر ہے۔ مدینہ کے تمام علماء و امرا، آخری دیدار کے لیے جمع ہو گئے۔ یحییٰ اندلسی کا بیان ہے کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا ہی تھا۔ وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے، وہ بھی روتے تھے تلامذہ کے علاوہ حدیث و فقہ کے ۱۶۰ علماء مودب با چشمِ گریاں آس پاس بیٹھے تھے۔

جسم کی حرارت آہستہ آہستہ سرد ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے قعنبی جو امام کے اخص تلامذہ میں تھے، وہ اسی وقت حاضر ہوئے اور گریہ کا سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ قعنبی، میں نہ روؤں تو کون روئے۔ اے کاش! مجھ کو میرے ہر قیاسی فتوے کے بدلہ ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔" گریہ جاری تھا۔ لب متحرک تھے کہ مرغِ روح قفسِ عنصری

سے پرواز کر گیا۔ اب بھی اسی طرح اردگرد طلبہ و علماء کا ہجوم تھا۔ لیکن صدر نشین بزم اب حیاتِ جاوید کے بستر پہ آرام کر رہا تھا۔

امام صاحب بروایاتِ صحیحہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا ۸۶ برس کی عمر شریف پائی۔ ۱۱۷ھ میں مسندِ درس پہ قدم رکھا تھا۔ ۶۲ برس تک علمِ دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

جنازہ میں ایک خلقت کا ہجوم تھا۔ والیٔ مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ پا شریک تھا اور نعش اٹھانے والوں میں خود وہ بھی داخل تھا۔ جنۃ البقیع مدینہ میں ایک مشہور مقام ہے۔ یہاں صرف وہ لوگ بستے ہیں جو حیاتِ اولیٰ کے منازل طے کر چکتے ہیں۔ اسلام کے ارکانِ عظام ام المومنین عائشہؓ حضرت عثمانؓ، امام حسنؓ، حضرت فاطمہؓ حضرت حفصہؓ اور دیگر اعلامِ اسلام اسی خاک میں مدفون ہیں، امام مدینہ کا جسدِ مبارک بھی اسی خاک کو سپرد ہوا[1]۔

عمر بن سعد الضاریؓ نے اس وقت یہ شعر کسی کو خواب میں پڑھتے سُنا۔

لقد اصبح الاسلام زعزع رکنہ　　غداۃ ثوی الہادی لدی ملحد القبر

اسلام کے ستون ہل گئے، جس صبح کو رہنما قبر میں آسودہ ہوا

امام الہدی مازال للعلم صائنا　　علیہ سلام اللہ فی آخر الدہر

وہ ہدایت کا پیشوا اور علم کا ہمیشہ محافظ رہا۔ اس پہ تا قیامت خدا کا سلام ہو۔

دور دراز شہروں اور ملکوں کے علماء کو جب امام کی وفات کی خبر پہنچی تو ہر جگہ ان کا ماتم کیا گیا۔ کوفہ میں سفیان بن عیینہ کو جب معلوم ہوا تو ان پہ سکوت طاری ہو گیا اور جب بولے تو یہ بولے کہ ما ترک علی وجہ الارض مثلہ روئے زمین پہ مالک

---

[1] ان بیانات کے لیے دیکھو ابن خلکان ترجمہ مالک بن انس، تزئین الممالک صفحہ ۴۱ مصر بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز دہلوی۔

نے اپنی مثال نہیں چھوڑی، حماد بن زید نے کہا۔

رحمة الله كان من الدين بمكان

خدا ان پر رحم کرے مذہب میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔

امام کا غم ۳۲۲ سال کے بعد بھی پاک دلوں سے کم نہ ہوا تھا، ابو محمد جعفر قاری بغدادی المتوفی سنہ ۵۰۰ھ نے امام کا مرثیہ کہا[1]

سقى جدثا ضم البقيع بمالك من المزن مرعاد السحائب مبراق	بجلی اور کڑک کے ساتھ برسنے والے بادل اس قبر کو سیراب کریں جو مالک کو اپنے آغوش میں لیے ہے۔
امام مؤطاه الذى طبقت به اقاليم فى الدنيا فساح وآفاق	وہ امام جس کی وہ موطا ہے، جس پر دنیا کے وسیع ملکوں اور گوشوں نے اتفاق عام کیا ہے
اقام به شرع النبى محمد له حذر من ان يضام واشفاق	وہ جس نے اپنی مؤطا کے ذریعہ پیغمبر کی شریعت کو قائم کیا اور جس کا اس کو ڈر تھا کہ اس شریعت پر کہیں ظلم نہ ہو۔
له سند عال صحيح وهيبة فللكل منه حين يرويه اطراق	اس کی سند بلند اور صحیح ہے اور اس میں ہیبت ہے جب وہ اس کی روایت کرتے ہیں۔ تو سب بغور سنتے ہیں۔
واصحاب صدق كلهم علم فسل به الفهم ان انت سائلت حذاق	ان کے بہت شاگرد رشید ہیں، جن میں ہر ایک مشہور ہے۔
ولو لم يكن الا ابن ادريس وحده كفا الا ان اسعادة ارزاق	اگر امام شافعی کے سوا کوئی اور ان کا شاگرد نہ ہوتا تو بھی ان کے لیے فخر کافی تھا، ہاں

---

[1] ابن خلکان ترجمہ مالک بن انس

خوش بختی بھی روزی ہے ۔

امام کی تاریخ پیدائش پر یہ قطعہ مشتمل ہے ۔

فخر الائمہ مالک	مالک اماموں کے فخر ہیں پیرو کے لیے
نعم الامام لسالک	بہترین پیشوا ہیں ۔
مولدہ "نجم ھدی"	ان کی تاریخ پیدائش ہدایت کا ستارہ (۹۳ھ) ہے
وفاتہ "فاز مالک"	اور ان کی تاریخ وفات یہ ہے کہ مالک کامیاب ہوئے (۱۷۹ھ)

اخلاق و کردار، ذاتی زندگی

مقدس بزرگوں کی اخلاقی صورت پر مبالغہ آمیز روایات کے اتنے پردے پڑجاتے ہیں، کہ حقیقت حال کا چہرہ مخفی ہوجاتا ہے۔ حالانکہ بزرگانِ سلف کی تاریخ زندگی میں یہی ایک باب ہے جو نسل مستقبل کے لیے آثار ہدایت ہے لیکن بحمد اللہ امام کی زندگی مبالغہ کی آمیزش سے پاک ہے۔

طاعت الٰہی

امام کا شمار عُبّادِ زمانہ[1] میں تھا۔ درس و افتا سے جو فرصت ملتی وہ زیادہ تر عبادت اور تلاوت میں صرف ہوتی، امام کی خواہر محترمہ سے کسی نے پوچھا کہ امام مالک گھر میں کیا کرتے ہیں۔ تو جواب دیا کہ ان کے دو کام ہیں المصحف والتلاوہ[2]" امام صاحب کی صاحبزادی سے منقول ہے، کہ امام جمعہ کی شب عبادت وطاعت میں مشغول رہتے تھے، امام صاحب کے بھانجے ابن یونس سے روایت ہے کہ امام مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ وار رہتے تھے[3]،

حبِّ رسول

امام صاحب حضرت سرورِ کائنات صلعم کا بیحد ادب کرتے تھے جب نام مبارک زبان پر آتا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن ارواحِ طیبات کی زیارت کی ہے، ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر ہے[4]

---

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر عباد [2] مناقب مالک للزوادی عن ابی ذہب صفحہ ۱۳۳،

[3] تزیین الممالک عن الخطیب صفحہ ۱۸۔

[4] مناقب مالک للزوادی عن حصب بن عبداللہ صفحہ ۳۴۳

مسجد نبوی جس کے ایک حجرے میں روضہ انور ہے۔ اس میں شور و غل ناپسند فرماتے کہ یہ آستانۂ نبوت سے گستاخی ہے، کلام نبوی اس وقت تک زبان پر نہیں آتا، جب تک وضو یا غسل فرما کر باادب بیٹھ نہ لیتے، امام کے اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے، اگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ نکلے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدم نبویؐ سے مشرف ہوئی ہے، اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں، ذات نبویؐ کی محبت اور حدیث نبوی کے شغل و انہماک کے سبب سے کوئی ایسی شب نہ گزرتی جس میں عالم رویا میں زیارت نبویؐ کا شرف حاصل نہ ہوتا۔[2]

حب مدینہ

امام کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے۔ منصور نے بغداد کی سکونت کے لیے درخواست کی، پذیرائی نہ ہوئی، مہدی نے ۳ ہزار دینار بھیجے اور پھر کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجیے، فرمایا اشرفیاں علی حالہا رکھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ، مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا،[3] بقول نووی المدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف امام مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو برتری دیتے ہیں۔[4]

فیاضی

آج علما کا بخل و افلاس دیکھ کر کون نتیجہ نکال سکتا ہے، کہ علمائے سلف کی فیاضیاں شاہانہ فیاضیوں سے کم نہ تھیں۔ ربیعہ نے اپنی تعلیم پر ۳۲ ہزار دینار صرف کیے، امام ابو حنیفہ طلبہ کو درہم و دینار کے کیسہ حوالہ کر دیتے تھے، امام لیث مصری اپنی دولت کا کثیر حصہ ان مصارف پر صرف کرتے تھے۔ امام مالک کی فیاضی بھی کم نہ تھی، ایک بار امام شافعی کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعی نے بعض گھوڑوں کی

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۹۳۴ [2] ترجمہ مالک جلد ۱ مصر [3] تزئین عن ابی نعیم والخطیب صفحہ ۱۲۔ [4] تذکرہ ذہبی جلد ۱ صفحہ ۱۵۰ حیدرآباد۔ [5] اعلام علماء الاعلام لعبد الکریم بن محب اللہ مکی صفحہ ۳ قلمی کتب خانہ بانکی پور۔

تعریف کی۔ امام صاحب نے تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا[1]۔ ہر سال امام شافعی کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔

مہمان نوازی

مہمان نوازی ایک عرب کا خاصہ اور ایک مومن کا فرض ہے لیکن امام صاحب کا میزبانہ اخلاق اس سے بھی زیادہ تھا۔ امام شافعی جو طلب علم کے لیے امام کے گھر اُترتے تھے، امام ان کے لیے ہاتھ سے خوان اُٹھا کر لاتے تھے صبح کی نماز کے لیے اپنے ہاتھ سے پانی لا کر رکھتے تھے وقت رخصت، با ایں ہمہ ضبط و خودداری خود بازار تک جا کر سواری کرایہ کر دی اور ایک کیسۂ زر زادِ راہ کے لیے عنایت کیا[2]۔

استقلال

استقلال طبع ایک فضل الٰہی ہے کوفہ کی جامع مسجد میں ایک بار خارجی شمشیر بکف گھس آئے۔ تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، لیکن امام ابو حنیفہ نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، ایک بار کا واقعہ ہے کہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں پہن لیا، مجلس درس میں آ کر بیٹھ گئے۔ بچھو نے نیش مارا، اور پھر علی التواتر ستر بار نیش مارا، لیکن آداب مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا۔ چہرہ کا رنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا، اختتام درس کے بعد عبد اللہ بن مبارک نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ موزہ میں بچھو ہے[3]۔

حلم و عفو

خودداری اور جلالت شان کے ساتھ حلم و عفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے اکثر جمع نہیں ہوتا۔ لیکن امام میں یہ دونوں صفتیں مجتمع تھیں۔ ایک طرف تو منصور و رشید جیسے قہار سلاطین کو آپ ڈانٹ دیتے ہیں، دوسری طرف آپ کے شانۂ مبارک پر ذلیل ہاتھوں سے کوڑا مارا جاتا ہے۔ تو آپ انگیز کرتے ہیں۔ اور منصور جب مجرم کی سزا کا

---

[1] توالی التاسیس معالی ابن ادریس لابن حجر [2] مرأت الاوراق ابن حجر حموی جلد ا صفحہ ۲۰۰

[3] ابن خلکان ترجمہ مالک عام کتب۔

ذکر کرتا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا۔[1]

امام کے شاگرد خاص معن بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں کہ ابن سرخون نامی ایک شاعر امام صاحب کے پاس آکر کہنے لگا کہ میں نے ایک دو شعر میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، امام صاحب سمجھے کہ میری ہجو میں کچھ شعر کہے ہوں گے، فرمایا کچھ مضائقہ نہیں، اس نے کہا میں وہ شعر سنانا بھی چاہتا ہوں۔ امام صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، لیکن زبان حلم سے فرمایا کہ سنا بھی لو، شعر پڑھے تو اُس کا مفہوم یہ تھا کہ مدینہ کے مفتی مالک سے پوچھ لو کہ کیا محبت بھی کوئی گناہ ہے"، امام صاحب نے بہ متانت فرمایا کہ میں نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔[2]

حق گوئی و آزادی

علمائے سلف کی مشترک صفت یہ تھی کہ وہ نطقِ حق میں بیباک ہوتے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کی زندگی کا اہم ترین فریضہ تھا۔ گذشتہ صفحات کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ امام صاحب برابر خلفاء کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، امام صاحب نے فرمایا کہ اگر نہ جاؤں تو نطقِ حق کا موقع کہاں ملے؟ آپ نے پڑھا ہوگا کہ ایک بار منصور نے چند فقہا کے ساتھ امام مالک کو بلا بھیجا، اور پوچھا کہ تم لوگ مجھ کو کیا سمجھتے ہو، سب سے دلیرانہ تقریر ابن ابی ذئب نے کی، امام نے فرمایا کہ مجھ کو اس کے جواب سے معاف کرو، یہ سکوت و تعلل نطقِ مبین سے کم نہیں۔

امام کو کوڑے مارے گئے، لیکن کیوں؟ اس لیے کہ حق کے اظہار میں انہوں نے حکومت کی پروانہ کی، ایک بار منصور نے مسجد نبویؐ میں زور شور سے مناظرہ شروع کیا، فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے لَاتَوفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے جب عَلَم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت محمد نفس زکیہ کا حق ہے۔ عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔

---

[1] کتاب الامتہ ابن قتیبہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ مصر [2] طبقات سبکی جلد ۲ صفحہ ۵۲ مصر [3] مناقب مالک ملّا وادی صفحہ ۱۳۱ مصر

خودداری

علم کی شان یہ ہے، کہ اس کی جلالت ملحوظ رکھی جائے، کہ اہل علم لوگوں میں معزز ہوں اور لوگوں کو اکتساب علم کا ذوق پیدا ہو، امام مالک اس نکتہ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔

اس سے پہلے کئی بار گذر چکا ہے کہ امام صاحب مجلسِ درس میں کس وقار و متانت اور خودداری کے ساتھ بیٹھتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ ارید ان اجلّ لعلھم یعنی میں چاہتا ہوں کہ علم کی شان بڑھاؤں" بڑے بڑے امراء اور حکام آستانہ امامت میں حاضر ہوتے ہوئے کانپتے تھے۔ پڑھا ہو گا۔ کہ ہارون رشید نے اپنے خیمے میں املائے حدیث کے لیے بلایا تو فرمایا کہ لوگ علم کے پاس آتے ہیں۔ لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا ہارون رشید خود آیا تو مسند درس پہ بیٹھنا چاہا، فرمایا، تواضع محبوب ہے، ہارون رشید نے کہا آپ پڑھیے، امام نے فرمایا اپنی یہ عادت نہیں[1]

منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا تو خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، امام نے کبھی یہ ذلت گوارا نہ کی۔

انصاف پسندی

لیکن اس خودداری، اس جلال۔ اس اظہار حق سے زیادہ گراں قیمت اور مشکل الحصول شے انصاف پسندی ہے، اور وہ بھی اپنے نفس کے مقابلہ میں جس مسئلہ پر عبور نہ ہوتا بہ متانت فرما دیتے کہ مجھے نہیں معلوم" شاید اس مختصر فقرہ کی قدر عام لوگوں کی زبان سے نہ سمجھی جائے۔ لیکن فرض کرو کہ ایک شخص جاہ و حشمت اور کمال شہرت، وادعائے علم کے ساتھ مسندِ درس وافتاء پر متمکن ہے۔ طلبہ و اہل علم کا ہر طرف حلقہ ہے، دور دراز ممالک سے لوگ آ آ کر مسائل و فتاوے پوچھتے ہیں۔ اس وقت اربابِ اخلاقِ طاہرہ کے سوا کس کی طاقت ہے کہ "نہیں" کہے امام کے ایک شاگرد کا قول آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اگر میں امام کے "نہیں معلوم" کو

---

[1] مالک للزوادی ۲۵

لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن القاسم امام کے ایک شاگرد نے کہا کہ مصر کے علماء بیع و شرا کے مسائل میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ امام مالک نے پوچھا، انہوں نے کس سے ان کی تعلیم پائی؟ ابن القاسم نے کہا کہ آپ سے فرمایا کہ مجھے تو خود ان میں دخل نہیں۔[1]

اہل علم کی عزت

اس سے پہلے گذرا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید مجلس درس میں آیا تو مسند سے نیچے اتر کر اس کو بیٹھنا پڑا، لیکن ایک بار امام ابو حنیفہ تشریف لائے۔ تو آپ نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی، وہ اٹھ گئے تو طلبہ سے کہا کہ یہ عراق کے ابوحنیفہ ہیں، جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی۔ لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علیٰ قدر مراتب عزت کرنی چاہیے۔

عبدالرحمٰن بن قاسم آپ کے شاگرد تھے۔ لیکن جب ان کو خط لکھتے۔ تو فقیہ مصر لکھا کرتے تھے، ایک بار قعنبی محدث آپ کے نامور شاگرد مدینہ آ رہے تھے۔ امام صاحب اپنے تلامذہ کو لے کر خود بہ نفس نفیس ان کے استقبال کو شہر سے باہر نکل آئے۔[2]

حلیہ

امام صاحب کا حلیہ یہ تھا، رنگ سرخ و سپید، قد بالا۔ بدن بھاری، پیشانی کشادہ آنکھیں بڑی۔ ناک اونچی، داڑھی بڑی اور گھنی، سر میں قدرتاً بال نہ تھے۔ مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا ناپسند کرتے تھے۔ خضاب کا استعمال نہیں کیا۔

پوشاک

مزاج میں صفائی اور نزاہت غایت درجہ تھی۔ ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب بدن فرماتے تھے۔ بعض لوگ اس پر ٹوکتے تو فرماتے کہ "میں اس شہر (مدینہ) کے جس عالم سے ملا، اس کو خوش پوشاک پایا۔ امام صاحب کو اپنے کپڑوں

---

[1] مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر صفحہ ۱۲۵ مصر

[2] تذکرہ ذہبی جلد ۱ صفحہ ۳۵۱

کا خاص اہتمام تھا، عدن کے کپڑے اس زمانہ میں مشہور اور بیش قیمت ہوتے تھے[1] کبھی کبھی مرد کے بنے ہوئے کپڑے بھی استعمال کرتے۔[2]

خوشبو کا استعمال

خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے، عود کی انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں کپڑے خوشبو سے بسے رہتے تھے، جس گلی سے ایک بار نکل جاتے دیر تک اس میں خوشبو پھیلی رہتی۔ اور اکثر فرماتے کہ خدا نے جس کو نعمت دی ہو، اس کے آثار اس پر نہ ظاہر ہوں، میں یہ پسند نہیں کرتا، کبھی طیلسان بھی استعمال کرتے، جو اس زمانہ میں علماء کی نشانی تھی۔ عمامہ جب زیب سر فرماتے، شملہ گلے میں لپیٹ کر داہنے یا بائیں شانہ پر ڈال لیتے۔ ہاتھ میں چاندی کی ایک انگوٹھی تھی۔ جس کے سیاہ پتھر کے نگینہ پر حَسْبُنَا اللہ وَنِعْمَ الوکیل نقش تھا۔

امام کو جو خصوصیاتِ شرف حاصل تھیں۔ ان میں یہ کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مزید شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا۔ جو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا مکان تھا اور مجلس و نشستگاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا۔ یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اس بنا پر امام مالک نہ صرف علم و معارفِ فاروقی کے وارث تھے۔ بلکہ ان کی جائداد ظاہری کا بھی خدا نے انہیں وارث بنایا۔

---

[1] ابن حزم مطبوعہ یورپ صفحہ ۸۸ [2] مراۃ الجنان یافعی ذکر مالک

امام صاحب کی تصنیفات و تالیفات کا اجمالی ذکر

اس عہد میمون میں تصنیف و تالیف کی ابتدا ہو چکی تھی امام کے دستِ مبارک سے جو کتابیں ترتیب پائی ہیں، یا اُن کی طرف منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

موطا۔ رسالہ مالک الی الرشید، احکام القرآن، المدونۃ الکبریٰ۔ رسالہ مالک الی ابن مطرف۔ رسالہ مالک الی ابن وہب۔ کتاب الاقضیہ ،کتاب المناسک، تفسیر غریب القرآن۔ کتاب المجالسات عن مالک۔ تفسیر القرآن۔

۱۔ موطا کی نسبت مفصل بحث آئے گی۔

موطا میں اور ان کی تمام تصنیفات میں امتیاز اول یہ ہے کہ موطا کی روایت امام کے تمام تلامذہ نے کی ہے۔ اور بقیہ رسائل وکتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

۲۔ **رسالہ مالک الی الرشید**۔ یہ خلیفہ ہارون رشید کے نام خط کے طور پر ۲۲ صفحہ کا ایک رسالہ ہے۔ جس میں امام نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی و دنیاوی و اخلاقی نصائح کیے ہیں امام سے اس رسالہ کی روایت ابن حبیب نے کی ہے۔ رسالہ کا طرز بیان نہایت قدیم ہے اور موطا کے طرز روایت سے نہایت مشابہ ہے۔ بعض علماء نے اس بنا پر اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنے سے انکار کیا ہے۔ کہ اس میں بعض ضعیف و منکر حدیثیں ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ اخلاقیات میں محدثین اس قدر احتراز نہیں کرتے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں امام کے انتساب سے اس رسالہ کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ چوتھی صدی کے اوائل میں یہ رسالہ موجود تھا، یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔

---

[1] ان کتابوں کے نام مختلف مصنفین نے لکھے ہیں۔ جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

۳۔ **احکام القرآن** ۔ یہ خود امام کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہر علوم قرآن علامہ ابو محمد مکی بن ابی طالب الاندلسی المتوفی ۴۳۷ھ[1] کی تالیف ہے علامہ موصوف نے امام مالک سے جو احکام قرآن یعنی آیاتِ احکامیہ کی تفسیریں مروی ہیں۔ ان کو یکجا کر دیا جائے ۔ اسی لیے اس کا نام کتاب الماثور عن مالک فی احکام القرآن ہے ۔

۴۔ **المدونۃ الکبریٰ** فقہِ مالکی کی ایک ضخیم کتاب ہے ۔ بعض لوگ اس کو خود امام کی تصنیف سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے ۔ کہ یہ عبدالرحمٰن بن قاسم المتوفی ۱۹۱ھ امام کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے ۔ لیکن اس لحاظ سے امام کی تصنیف کہنا درست ہے ۔ کہ یہ کتاب درحقیقت امام کے ملفوظاتِ فقیہہ کا مجموعہ ہے ۔ ابن قاسم نے خود امام کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آکر امام کے مجتہدات و فقیہات کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا شروع کیا تھا۔ اور شاید اسی زمانہ میں ختم بھی ہو گئی تھی، کیونکہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی دوسری بار مصر سے مدونۃ ابن قاسم کو خود امام سے سننے کے لیے آئے تھے، لیکن افسوس کہ امام اس وقت بسترِ مرض پر تھے[2] مصر میں مدونۃ چھپ گئی ہے ۔ اور ہر جگہ ملتی ہے ۔

۵۔ **رسالۃ مالک الی ابن مطرف** عثان بن محمد بن مطرف کے نام "فتویٰ" کی بحث پر ایک رسالہ ہے ۔ خالد بن تزار اور محمد بن مطرف تلامذہ امام نے اس کی روایت کی ہے ۔

۶۔ **رسالۃ مالک ابن وہب** ۔ امام کے شاگرد رشید ابن وہب کے نام سے مسئلہ قضا و قدر پر ایک مشہور رسالہ ہے، قاضی عیاض نے اس رسالہ کی تعریف کی اور لکھا ہے ۔

وھو من خیار الکتب فی ھذا الباب دال علی سعۃ علیہ ھذا الشان

۷۔ **کتاب الاقضیہ** ۔ بعض قاضیوں کے لیے امام نے یہ رسالہ لکھا، غالباً اس میں عہدہ قضا کے متعلق اصول و ہدایات ہوں گے، امام کے ایک شاگرد عبداللہ بن جلیل نے اس کی

---

[1] ابن خلکان ذکر مکی بن ابی طالب جلد ۲ صفحہ ۱۲۰ مصر [2] ابن خلکان ترجمہ عبدالرحمٰن بن قاسم یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر المصمودی ۔

روایت کی ہے۔

۸۔ **الکتاب المناسک۔** ابو جعفر زہری امام کے ایک دوست کا بیان ہے کہ امام مالک کی سب سے بڑی تصنیف کتاب المناسک تھی، جس میں حج کے احکام و مسائل تھے۔

۹۔ **تفسیر غریب القرآن۔** اس کتاب کی روایت خالد بن عبدالرحمٰن مخزومی نے امام سے کی ہے۔

۱۰۔ **کتاب المجالسات عن مالک۔** ابن وہب امام کے تلمیذ رشید نے امام کے مجالس صحبت میں حدیث و آثار و اخلاق کے جو متفرق فوائد و نکات سنے اس رسالہ میں ان کو جمع کیا ہے۔ حافظ سیوطی نے یہ رسالہ دیکھا تھا۔

۱۱۔ **تفسیر القرآن۔** قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث قلمبند ہے، حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا تھا۔ اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے۔ کہ آیا یہ خود امام کی تالیف ہے۔ یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔

۱۲۔ **کتاب المسائل۔** ان رسائل و کتب کے علاوہ امام کی اور بھی تصنیفات تھیں، محدث خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے۔ کہ ابو العباس سفاح کے سامنے بہت سے منتشر اوراق پڑے تھے، جس کی نسبت اس نے کہا کہ یہ امام مالک کے ستر ہزار مسائل کا مجموعہ ہے۔[لہ]

موطا امام مالکؒ — اصح الکتب بعد کتاب اللہ

امام کی اصلی تصنیف "موطا" جو قرآن پاک کے بعد کتب خانۂ اسلام کی دوسری کتاب ہے، اوّل کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسُول (صلعم)

تدوین احادیث

ہجرت کی پہلی صدی تک احادیثِ نبوی کے گنجینے مقدس سینوں میں مدفون رہے، اور متفرق طور سے علیحدہ علیحدہ ہر شیخ کے پاس تحریری یادداشت کا مجموعہ تھا، قرن اوّل کے خاتمہ پر جب صحابہ کے بعد پہلی نسل (تابعین) پیدا ہو رہی تھی، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز المتوفی سنہ ۱۰۱ھ سریر آرائے خلافت ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز جس شان کے خلیفہ تھے، اسی شان کے محدّث بھی تھے، چنانچہ علامہ ذہبی نے حفاظ میں آپ کو جگہ دی ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی یہ علمی جلالت کیا کم ہے کہ امام مالک مؤطا میں ان کے فتاویٰ سے استدلال کرتے ہیں، احادیث کی تدوین بصورتِ کتاب کی ابتداء اسی خلیفۂ اعظم کے اشارہ سے ہوئی ہے، اور سب سے پہلے مدّون حدیث ابوبکر بن حزم المتوفی سنہ ۱۲۰ھ ہیں۔

ابوبکر بن حزم کے بعد محمد بن شہاب الزہری جو تمام محدثین کے امام ہیں، حدیث کے دوسرے مدوان ہیں، ربیع بن صبیح اور سعد بن عروبہ تیسرے درجہ پر ہیں، پہلا نسخہ جو ابوبکر کے ہاتھ سے تیار ہوا تھا، عموماً صحابہ کے فتووں پر مشتمل تھا، امام زہری کا نسخہ حدیث ابواب و فصول پر منقسم نہ تھا ربیع اور سعد کے نسخوں کا

ہر باب علیحدہ تھا۔

سنہ ۱۳۲ھ ایک نئے دور کی بنیاد ہے، خلافتِ امویہ مٹ کر خلافتِ عباسیہ قائم ہوتی ہے، اسی کے پس وپیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے اور موطا کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر صحابہ ارشاد جہاد وغزا کی نیت سے تمام بلاد مفتوحہ میں پھیل گئے تھے، حضرت جابرؓ مکہ میں، حضرت ابودرداؓ اور ابوذرؓ شام میں، عقبہ بن عامر مصر میں، بریدہؓ خراسان میں حضرت علیؓ وعبداللہ بن مسعود کوفہ میں وقس علی ذلک لیکن صحابہ کا گروہِ عظیم جن میں اکابر واجلۂ فقہا داخل تھے۔ مدینہ ہی میں رہا، یہ مقدس گروہ جہاں تھا، اپنے مرئیات ومسموعات کی روایت کرتا رہا، ان کے بعد ان مقامات وبلاد کے علمائے تابعین ان کے مرویات وعلوم کے وارث ہوئے، دوسری صدی کے اواخر تک یہ علوم روایۃً وتحریراً اسی طرح منتشر رہے۔ ان کا مرکزِ اول مدینہ اور مرکزِ ثانی مکہ معظمہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق تھا۔ امام شافعی اور عبداللہ بن مبارک پہلے شخص ہیں جنہوں نے معلومات کے لحاظ سے اور امام احمد بن حنبل وامام بخاری نے تحریر وتدوین میں ان کو یکجا کیا،

امام مالک کا عہد وہ ہے۔ جب یہ معلومات تمام بلادِ اسلامیہ میں منتشر تھے اسی لحاظ سے امام مالک کے عصر میں جن مجموعہائے حدیث کی تدوین ہوئی وہ صرف اپنے اپنے حدود ملکی کے اندر محدود تھے۔ ابن جریج نے مکہ میں اوزاعی نے شام میں سفیان ثوری نے کوفہ میں ابوسلمہ حماد نے بصرہ میں، ہشیم نے واسط میں، معمر نے یمن میں، ابن مبارک نے خراسان میں، جریر بن حمید نے رے میں حدیثیں جمع کیں، لیکن مرکزِ نبوت اور مہبطِ وحی کی حدیثوں کی جمع وترتیب، جو

علوم نبوی کا سب سے بڑا گنجینہ تھا، جس سعادت اندوز کی قسمت میں تھا۔ وہ امام مالک ہیں۔

موطا[1]

علوم مدینہ کا مجموعہ ہے، جہاں ان زر و جواہر کی اصلی کان تھی، تمام اکابر صحابہ، و اعاظم تابعین، جن کا ذکر بہ تفصیل اوپر کئی بار گذر چکا ان کا مسکن یہی شہر مبارک تھا۔ اور اسی لیے یہ صحیفہ مقدس انہی بزرگوں کی روایات و فتاویٰ پر مبنی ہے، اس بنا پر یہ صحیفہ حقیقت میں صحیح ترین، موثق ترین اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے۔[2]

تالیف موطا

یہ ظاہر ہے کہ امام مالک ہمیشہ مدینہ ہی میں قیام فرما رہے۔ اس لیے اس تالیف کا مقام معلوم ہے، لیکن صحیح زمانہ نہیں معلوم بقرائن معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنہ ۱۳۰ھ سے سنہ ۱۴۰ھ تک کا زمانہ ہے، سنہ ۱۳۰ھ سے زوال بنی امیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے تصنیف و تالیف کا شغل عام نہ تھا۔ سنہ ۱۴۴ھ میں منصور نے آخری حج کیا ہے اس وقت موطا متداول و مشہور ہو چکی تھی۔[3] اس لیے زمانہ تالیف ان دونوں زمانوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی۔ اور فرمائش کی تھی کہ اس مجموعہ احکام میں نہ ابن عمرؓ کی سختیاں ہوں نہ ابن عباسؓ کی رخصتیں، اور نہ ابن مسعودؓ کے شواذ۔[4]

امام صاحب جب موطا کی تالیف میں مشغول ہوئے، اور یہ خبر اوروں کو بھی پہنچی تو مدینہ کے اور علماء بھی اپنے اپنے احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے۔ لوگوں نے امام سے جا کر عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ صرف حسن نیت کو بقا ہے" یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی دیکھو کہ موطا مالک کے سوا کوئی موطا دنیائے معلوم میں باقی نہیں رہی، بعض لوگوں نے رشک کا

---

[1] اس فصل کے تمام معلومات کے لیے مقدمہ فتح الباری دیکھو [2] مقدمہ مسویٰ شاہ ولی اللہ صاحب [3] کشف الظنون موطا" و جامع بیان العلم ابن عبدالبر صفحہ ۶۷، مصر [4] کتاب الامامۃ و السیاسۃ ذکر منصور۔

انتقام دوسری طرح لیا، محمد بن اسحاق صاحب سیر و مغازی نے کہا۔

ایتونی بکتبه حتی ابین
عیوبه فانا بیطار کتبه[1]

مالک کی کتابیں میرے پاس لاؤ میں ان کے عیوب دکھاؤں۔ مالک کی کتابوں کا ناقد تو میں ہوں۔

امام مالک نے تصنیف سے فارغ ہو کر شیوخ حدیث کی خدمت میں اس کو پیش کیا سب نے اس کو بغایت پسند کیا، عام اہل مدینہ کے لیے وہ دن عجیب مسرت کا تھا۔ جب ان کے مجموعہ فضائل میں ایک اور فضیلت کا اضافہ ہو رہا تھا[2]۔ سعد بن نام ایک شاعر مؤطا کی تعریف میں کہتا ہے۔

اقول لمن یروی الحدیث و
یکتب ویسلک سبیل الفقه
فیه ویطلب
ان احببت ان تدعی لدی الخلق
عالماً فلا تعد ما یحوی من العلم یثرب
اتترک داراً کان بین بیوتها یروح و
یغدو جبریل ارتوب ومات
رسول اللّٰه فیها وبعده بسنة
اصحابه قد قادبوا

میں اس سے کہتا ہوں جو حدیث کی روایت کرتا ہے اور اس کو لکھتا ہے اور فقہ کے راستہ میں چلتا ہے۔ اور اس کی طلب میں سرگرداں ہے۔ اگر تجھ کو یہ پسند ہے کہ مخلوق میں تو عالم پکارا جائے تو اس علم سے باہر نہ جا جس کو یثرب حاوی ہے کیا اس مقام کو تو چھوڑتا ہے جس کے گھروں میں مقرب بارگاہ جبریل آیا جایا کرتا تھا۔ اور جس میں رسول اللّٰہ نے وفات پائی۔ اور ان کے بعد انکی سنت سے آپ کے اصحاب نے ادب پایا۔

فبادر موطا مالک قبل فوته
فما بعده ان فات للحق مطلب

تو مالک کی موطا کو جلد لو کھونے نہ پائے، کہ اگر یہ کھو گئی تو حق کی جستجو کی پھر جگہ نہیں،

---

[1] تہذیب الکمال مالک انس [2] بستان المحدثین ذکر امام مالک

ودع للموطا کل علم تویدہ
فان الموطا الشمس والغیر کوکب

اور موطا کے لیے ہر اس علم کو جس کو چاہتے ہو
چھوڑ دو کہ موطا آفتاب ہے اور اس کے علاوہ
دوسری کتابیں ستارہ ہیں۔

وجہ تسمیہ

لفظ "موطا" توطیہ کا مفعول ہے۔ جس کے معنے "روندنے" اور کسی چیز پر چلنے کے ہیں۔ موطا کے لغوی معنی "روندا ہوا" یا چلا ہوا" کے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی میں لکھا ہے۔ روندے ہوئے یا چلے ہوئے کے" مجازی معنی یہ ہیں کہ جس پر عام ائمہ اور علماء اور اکابر چلے ہوں، اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو۔ یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو، اور اس سے اتفاق کیا ہو۔ اس طرح گویا اس کے معنی متفق اور مطابق کے ہیں۔ چونکہ تصنیف کے بعد تمام شیوخ حدیث نے اس سے اتفاق و مطابقت کی، اس لیے اس کا نام موطا مشہور ہو گیا۔[1] لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے۔ کہ مُوطا" اس راستہ کو کہتے ہیں۔ جس پر لوگ بکثرت گذرتے ہیں"۔ سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے۔ جس پر آنحضرت صلعم گذرے موطا وہ پامال راستہ ہے۔ جس پر آنحضرت صلعم کے بعد تمام صحابہ گذرے۔ غرض مُوطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ یہ ان مسائل پر مشتمل ہے۔ جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔

تعداد مرویات

ابتداءً موطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں، لیکن امام کے خامہ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار حدیثیں قلم زد کر دیں۔ باقی ۱۷۲۰ ہیں جن میں سے مسند اور مرفوع ۶۰۰ ہیں، مرسل ۲۳۵، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال و فتاوی ۲۸۵، بلاغاتِ مالک[3] ۵۔

---

[1] مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب صفحہ ۶

[2] مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب صفحہ ۶ [3]

موطا کا موضوع

مؤطا کا موضوع صرف احکام فقیہہ ہیں۔ اس لیے وہ سینکڑوں ابواب وفصول جو بخاری ومسلم وترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں، مؤطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقیہات سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بنار پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو "کتاب السنن" کہنا چاہیئے۔

مؤطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہائے حدیث

فقہائے مجتہدین اربعہ میں سے ہر ایک کے انتساب سے ایک مجموعہائے حدیث موجود ہے، مسند ابی حنیفہ مسند شافعی مسند ابن حنبل یہ تمام کتابیں موجود ہیں، فقیہ رابع کی تصنیف کو ان پر کیا فوقیت حاصل ہے۔ اس جواب کے پردہ میں یہ ظاہر کر دینا ہے۔ کہ امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے علم حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی۔

وذلک فضل اللہ یوتیہ من شاء مسند ابی حنیفہ کے نام سے متعدد کتابیں موجود ہیں، مگر دراصل یہ تمام کتابیں امام ابوحنیفہ کے سینکڑوں برس بعد امام ممدوح کے تلامذہ کی تصنیفات، اور غیر معروف مسانید سے لے کر محمد بن یعقوب اور حسین بن محمد خسرو وغیرہ نے تالیف کی ہیں۔ اور ان کو مسندِ ابوحنیفہ اور مسندِ امام اعظم کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

مسندِ امام شافعی کی حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنی تصنیفات میں بر سبیل استدلال جو حدیثیں روایت کی ہیں ابوجعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری یا ابوالعباس نام ایک شافعی نے ان کو یکجا کر دیا ہے۔ مسند ابن حنبل کی تالیف یقیناً خود امام احمد نے شروع کی تھی، لیکن وہ ابھی مسودہ تھا کہ امام موصوف نے وفات پائی، اس کی تبییض وترتیب بعد کو امام احمد کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی، جو افسوس ہے کہ اس میدان کے مرد نہ تھے۔ اسی طرح مدنی اور عراقی مسندوں میں تخلیط ہے۔ اس بنا پر اس کو بجائے مسند احمد کے مسند عبداللہ کہنا چاہیئے۔ اور با ایں ہمہ اس میں صحیح احادیث کا التزام نہیں ہے، جیسا کہ ناقدین حدیث

جانتے ہیں ۔

مؤطا اور اس کی معاصر کتابیں

موطا سے قبل اور خود اس کے زمانہ میں بیسیوں مسانید اور موطائیں لوگوں نے لکھیں جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں۔ باہمی موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ موطا اور ان کتب معاصرہ میں وہی نسبت ہے جو صحیح بخاری کو مصنف ابن ابی شیبہ اور کتب بیہقی سے اور خود ان کتابوں کا فقدان اور عدم شہرت و قبول اور موت اس پر کافی دلیل ہے ۔ لیکن بایں ہمہ تین خاص وجوہ ایسے ہیں جن سے مؤطا کا امتیاز بالکل روشن ہو جاتا ہے۔

ا۔ مؤطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی گئیں، ان کا مبنیٰ زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوے تھے۔ امام مالک نے مؤطا میں احادیث صحاح و مسند یا منقطع و مرسل کو مبنائے اوّل اور آثار و فتاوے کو مبنائے ثانی قرار دیا۔

۲۔ دوسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا اور موطا میں صرف اسی حدیث یا فتوےٰ نے جگہ پائی ہے ۔ جس کو صحت کا شرف حاصل تھا۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ موطا مدینہ میں تالیف ہوئی ہے، اس کے رواۃ حجازی ہیں اور دیگر مسانید اور موطائیں کوفہ، بصرہ، واسط، شام، یمن، خراسان اور رَے وغیرہ میں تالیف ہوئیں اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں ۔

طبقات کتب حدیث میں مؤطا کا درجہ

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علمائے حدیث نے کتب کو چار مختلف طبقات میں منقسم کیا ہے۔ طبقۂ اولیٰ میں صرف وہ تصانیف ہیں ، جن کے مصنفین حدیث کے امام اور فن کے نقاد تھے۔ اور جن کی تصانیف صحت، جودتِ اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں ۔ اور جن کے رجال ، حفظ ، ثبوت ، وثوق اور شہرت

میں معروف ہیں، طبقہ ثانیہ میں اس سے کم درجہ وعلیٰ ہذا الترتیب ۔

طبقۂ اولیٰ میں موطا، بخاری اور مسلم داخل ہیں ۔ اور طبقہ ثانیہ میں ترمذی ابوداؤد نسائی ۔ ان دونوں طبقات کو صحاح ستہ کہتے ہیں، ابن اثیر المتوفی سنہ ۶۰۶ھ نے جامع الاصول میں انہی چھ کتابوں کو جمع کیا ہے ۔

طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ

طبقہ اولےٰ یعنی موطا، بخاری اور مسلم میں مؤطا کا کیا درجہ ہے، علمائے حدیث اس کے جواب میں مختلف الرائے ہیں، عام علمائے تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدما اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ بخاری و مسلم کی فوقیت اگر کثرتِ روایات، کثرت مرفوعات اور مرسل و موقوف حدیثوں سے پاک ہونے کی بنا پر ہے ۔ تو صحیح ہے ۔ لیکن مدار فضیلت تو صرف "صحت" "جودت اسناد" اور شہرت کی بنا پر ہے ۔ یہ صحیح ہے ۔ کہ مؤطا میں مرسل موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں جو "صحیح" کے لیے قادح ہیں، لیکن ان کا ارسال ، وقف اور انقطاع مؤطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے، لیکن حقیقت کی رو سے یہ تمام مراسیل وموقوفات ومنقطعات، متصل، مرفوع ومسند ہیں ۔ اور خود ان کے رفع واتصال واسناد پر امام بخاری وامام مسلم وترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے ۔ اس حالت میں خیال کیجئے کہ مؤطا کی صحت کا درجہ کہاں تک پہنچ جاتا ہے ۔

ار مؤطا کو سب سے بڑا شرف یہ حاصل ہے ۔ کہ یہ اسلام کی پہلی کتاب، کلام اللہ کے بعد اسلام کے ہاتھ میں دوسری صحیح کتاب کلام الرسول آئی، جو مؤطا کے قالب میں ظاہر ہوئی ۔ کشف الظنون میں ہے ۔ اول کتاب وضع فی الاسلام مؤطا مالک بن انس سب

۱؎ دیکھو حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ذکر علم حدیث

سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی ہے، وہ مؤطا ہے۔ قاضی ابوبکر ابن عربی المتوفی سنہ ۵۴۶ھ مؤطا کی شرح میں لکھتے ہیں۔

هذا اول كتاب الّف فى شرائع الاسلام	یہ پہلی کتاب ہے، جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے۔

حضرت سفیان کہتے ہیں

اول من صنف الصحيح مالك والفضل للمتقدم	سب سے پہلے مالک نے صحیح کو تالیف کیا

۲۔ صرف تقدم زمانہ ہی مؤطا کے تقدم کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ باوجود نقش اوّل ہونے کے اس کے بعد کی کتابیں گو، کہ مؤطا کی نقشِ ثانی ہیں، تاہم اس کی برابری کا دعوےٰ نہیں کرسکتیں چنانچہ اس کے متعلق ائمہ مجتہدین اور علمائے حدیث کی قوی شہادتیں موجود ہیں، امام شافعی المتوفی سنہ ۲۰۴ فرماتے ہیں۔

ما على وجه الارض من كتاب بعد كتاب الله اصح من مؤطا مالك ابن انس۔	روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے
ابوبکر ابن عربی فرماتے ہیں:	
هذا اول كتاب وضع فى الاسلام وهو اخره لانه لم يولف مثله	یہ اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے اور سب سے پچھلی بھی ہے، کیونکہ پھر اس کی مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی،

امام نووی شرح مسلم کے دیباچہ میں اپنے اسناد کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

وقد وقع اعلى من هذا الكتاب وان كانت عالية مؤطا الامام مالك وهو شيخ الشيوخ المذكورين	ایک کتاب مجھ کو ملی جو ان تمام کتابوں (بخاری ومسلم وترمذی و ابوداؤد ونسائی) سے بہتر ہے، اگرچہ یہ کتابیں بھی اچھی ہیں، وہ مؤطا

١٧ ہے، جس کے مصنف امام مالک ہیں، جو تمام
محدثین کے شیخ الشیوخ ۔

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں، کتاب الام میں امام شافعی کی، اور کتاب الآثار میں امام محمد کی جو فقاہت ہے، وہ مؤطا ہی کے صدقہ میں ہے۔

٣۔ امام بخاری اور امام مسلم سے جن لوگوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت کی ہے گو ان کی کثرت تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہے، مگر امام مالک سے مؤطا کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں، وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں، اس لیے خواص وعام کی نقل وروایت میں جو فرق ہے، وہ یقیناً مؤطا اور دیگر کتب کے نقل وروایت میں ہے۔

ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعی اور امام محمد نے اور محدثین میں سے بے شمار لوگوں نے امام مالک سے مؤطا کی روایت کی ہے۔ انہی میں سے بے شمار لوگوں نے ہیثم جمیل محدث انطاکیہ امام منصور بن سلمہ، محدثِ بغداد، عبداللہ بن وہب محدثِ مصر، یحییٰ بن یحییٰ استاد امام مسلم قتیبہ ابن سعد وغیرہ ہیں۔ فقہا میں سے فقیہ ہشام بن عبداللہ بن قاسم مؤلف مدونۃ الکبریٰ وغیرہ، صوفیہ میں حضرت ذوالنون مصری، خلفا میں ہادی، مہدی، ہارون مامون، امین اور عام علماء میں سے تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے مؤطا امام مالک سے روایت کی ہے۔ سیوطی نے تنویر الحوالک میں لکھا ہے، کہ امام مالک سے روایت کرنے والوں کی جتنی کثیر تعداد ہے۔ اتنی کسی امام کے رواۃ کی نہیں"۔

یہ ایک کھلی بات ہے، کہ رسول اللہ صلعم اور مؤلفِ حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے، اسی قدر اس کی تالیف درجۂ اعتبار میں زیادہ ہوگی۔ بخاری ومسلم کی عموماً روایتیں پانچ چھ واسطے سے ہوتی ہیں، مؤطا کی حدیثیں دو تین واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہوتیں، امام بخاری کو اپنے بیس ثلاثیات پر ناز ہے۔ اور مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے۔ اور علاوہ ازیں اس میں چالیس ثنائیات ہیں، یعنی ایسی حدیثیں ہیں جن میں مؤلف اور آنحضرت صلعم

کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔

مؤطا کے نسخے

سینکڑوں لوگوں نے امام صاحب سے مؤطا کو مختلف زمانوں میں حاصل کیا، اس کثرت تعداد اور اختلاف اوقات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک کی روایت میں کسی نہ کسی قدر کتاب کے ابواب کی ترتیب اور تقدیم وتاخیر اور بعض الفاظ میں اختلاف ہو، چنانچہ مؤطا امام صاحب سے تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور ۱۶ نسخے ہیں، ان میں سے معتبر اور باوثوق اول کے گیارہ اور معتبر اور باوثوق تر چار ہیں، یعنی یحییٰ، ابن بکیر، ابو مصعب اور ابن وہب کے نسخے، لیکن متداول ترین مشہور ترین اور مقبول ترین یحییٰ کی روایت ہے، کتاب کی مشہور ترتیب یہ ہے کہ اول کتاب الجنائز پھر کتاب الصلوٰۃ، پھر کتاب الصیام، پھر ۔اس کے بعد تمام نسخے کتاب الحج کے بعد سے پھر مختلف الترتیب ہیں۔ اس قسم کا اختلاف بخاری ومسلم سب میں ہے۔

۱۔ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی بربر کے رہنے والے تھے، ان کے دادا پہلے شخص ہیں جو ان کے خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے، قرطبہ میں امام صاحب کے تلمیذ خاص ابو عبداللہ زیاد بن عبدالرحمٰن بن زیاد لخمی درس دیتے تھے، یحییٰ نے پہلے انہی سے پوری مؤطا کی قرأت کی، مگر شوق علم بیس سال کی عمر میں قرطبہ سے نکال آستانہ امامت تک لے آیا مگر قسمت نے یحییٰ کو امام صاحب سے پوری مؤطا نہ پڑھنے دی اسی سال امام کا انتقال ہوگیا۔ اسی لیے یحییٰ کے نسخے میں تمام احادیث "حدثنا مالک" سے شروع ہوتی ہیں لیکن باب خروج المعتکف الی العید، باب قضاء الاعتکاف، باب النکاح فی الاعتکاف میں حدثنا زیاد عن مالک ہے"۔ یعنی ایک واسطہ زیادہ ہے۔

امام صاحب یحییٰ کی بڑی عزت کرتے تھے، اندلس میں سلطنت بھی ان کا خاص احترام کرتی تھی، چار مسئلوں کے سوا ہر بات میں وہ امام صاحب کے مقلد تھے، ۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے، ۸۲ سال کی عمر پائی ۲۳۴ھ میں انتقال کیا۔

۲۔ یہ نسخہ عبداللہ بن وہب کی تالیف ہے۔ مصر وطن تھا، مشہور محدث لیث ابن سعد مصری سے حدیث حاصل کی تھی، امام صاحب کی شہرت مصر سے ان کو مدینہ لے آئی، امام صاحب کے شاگردوں میں تالیف وتصنیف کے لیئے انہی کے دل ودماغ کو قدرت الٰہی نے منتخب کیا تھا۔ مسموعاتِ امام مالکؒ کے نام سے انہوں نے تین کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تمام تصنیفات میں ایک لاکھ بیس ہزار حدیثیں بر سبیل تذکرہ مروی ہیں۔ اور سب صحیح ہیں۔ ذیقعدہ ۱۲۵ھ سال پیدائش ہے۔ اور شعبان ۱۹۷ھ سال وفات۔

۳۔ اس کے راوی عبداللہ بن مسلمہ قعلبنی ہیں۔ محدثین ان کو حدیث دانی میں امام صاحب کے تمام تلامذہ پر فوقیت دیتے ہیں۔ آٹھ برس امام صاحب کی خدمت میں رہے جب یہ بیمار ہوتے تو امام صاحب خاص طور سے ان کی عیادت کو تشریف لے جاتے تھے۔ محرم ۲۲۱ھ میں وفات پائی۔

۴۔ مالکی مذہب کے مشہور فقیہ ابن القاسم اس کے راوی ہیں۔ مالکی مذہب کی پہلی تدوین انہی سے شروع ہوتی ہے۔ کتاب المدونۃ الکبریٰ انہی کی تالیف ہے۔ فتاوائے امام مالک کو انہوں نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ زہد وتقوےٰ میں ممتاز تھے۔ ابن القاسم نہ صرف میدان علم کے شہشوار تھے، بلکہ روم بربر، زنج کے جہاد میں بھی اپنی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ صرف کیا تھا۔ مصر میں ۱۹۱ھ میں وفات پائی۔

۵۔ معن بن عیسیٰ۔ امام بخاری ومسلم وترمذی کے شیخ ہیں، امام صاحب نے ان کو متبنیٰ کیا تھا۔ ہارون رشید نے امام صاحب کے درس میں انہی کی قرأت کی سماعت کی تھی امام صاحب کے چالیس ہزار فتاویٰ ان کو یاد تھے، مدینہ میں ۱۹۸ھ میں انتقال کیا۔

۶۔ عبداللہ بن یوسف گو پیدا دمشق میں ہوئے تھے، لیکن سکونت اندلس میں تھی، امام بخاری کے شیخ ہیں، امام بخاری ان کے علم وفضل کے مداح ومعترف تھے۔

۷۔ یحییٰ بن بکیر، امام بخاری بلا واسطہ اور امام مسلم بیک واسطہ ان سے روایت کرتے

ہیں ۔ امام صاحب سے مؤطا انہوں نے چودہ مرتبہ پڑھی تھی ۔ امام صاحب کی ثنائیات کو انہوں نے الگ الگ رسالہ میں جمع کیا ہے ۔ علمائے اندلس اپنے شاگردوں کو فراغت کی سند دیتے تھے تو اس کو تبرکاً پڑھا کرتے تھے ۔ بعض لوگوں نے اپنی ناواقفی سے ان پر جرح کی ہے ۔

۸ ۔ سعید بن عفیر، مشاہیر مصر سے ہیں، لیث مصری اور امام مالک سے روایت کرتے ہیں امام بخاری نے ان سے روایت کی ہے ۔ علم حدیث کے علاوہ تاریخ، سیر، ادب، علم الانساب اور شاعری میں بھی ان کو کمال تھا، سنہ ۱۴۶ھ میں پیدا ہوئے، اور سنہ ۲۲۶ھ میں وفات پائی ۔

۹ ۔ ابو مصعب زہری شیوخِ مدینہ میں سے ہیں، جب تک یہ زندہ رہے، حجاز والے اہل عراق کو آنکھ نہیں لگاتے تھے، صحاح ستہ میں ان کی روایت ہے، سب سے اخیر جو مؤطا امام صاحب کو سنائی گئی ہے ۔ وہ انہی کی روایت سے ہے ۔ سنہ ۲۴۰ھ میں جب انہوں نے وفات پائی تو مدینہ میں خدمتِ قضا پہ مامور تھے ۔

۱۰ ۔ اس کے راوی مصعب بن عبداللہ زبیری ہیں ۔

۱۱ ۔ یہ محمد بن مبارک کی روایت سے ہے ۔

۱۲ ۔ سلمان بن برد، غافقی نے ان بارہ نسخوں کو ملا کر ایک ضخیم کتاب تالیف کی ہے ۔

۱۳ ۔ یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ،

۱۴ ۔ ابو حذافہ سہمی، محدثین ان کو قابلِ وثوق نہیں سمجھتے ۔ امام صاحب کے شاگردوں میں سب سے اخیر بغداد میں سنہ ۲۵۹ھ میں وفات پائی ۔

۱۵ ۔ ابو محمد سوید بن سعید ہروی، مسلم اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے ۔ اخیر عمر میں ان کے حفظ میں ضعف آگیا تھا ۔ سنہ ۲۴۰ھ میں انتقال کیا ۔

۱۶ ۔ حنفی مذہب کے نامور مصنف امام محمد بن حسن شیبانی، اس مؤطا کے راوی ہیں ۔ اصل وطن شام تھا ۔ واسط میں پیدا ہوئے اور کوفہ میں نشو و نما پائی، امام مالک سے حدیث اور امام ابوحنیفہ سے فقہ حاصل کی ۔ عربیت، نحو، فقہ، حساب کے ماہر تھے، سنہ ۱۸۹ھ میں رے

میں وفات پائی۔

امام محمد نے چونکہ اپنے طور سے مؤطا کو ترتیب دیا ہے، اور ہر حدیث کے ختم پر حنفی مسائل کو ثابت کرنا چاہا ہے۔ اور امام صاحب کے سوا امام ابوحنیفہ کی حدیثیں بھی اسی میں نقل کی ہیں، اس لیے یہ موطا بجائے مؤطائے امام مالک کے موطائے امام محمد کہلاتی ہے۔

شروح و تعلیقات

کسی تصنیف کے قبول وہر دلعزیزی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کو شارحین، معلقین و محشین کی ایک بہت بڑی جماعت ہاتھ آئے اور کمیت بھی کوئی اس قدر بڑی چیز نہیں جس قدر کیفیت ہے یعنی یہ کہ فضل و کمال میں ان کا کیا پایہ تھا۔ مؤطا ان دونوں خصوصیات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے، تقریباً پچیس علمائے کبار نے اس کی شرح و تعلیق اور دیگر خدمات انجام دیئے ہیں، یہ تو کمیت کا حال ہے، کیفیت کے لحاظ سے دیکھیے تو ان میں قدما سے ابن حبیب مالکی المتوفی سنہ ۴۳۹ھ امام ابوسلیمان البستی الخطابی المتوفی سنہ ۳۸۸ھ ابن رشیق قیروانی المتوفی سنہ ۴۵۶ھ، محدث بن عبدالبر المتوفی سنہ ۴۶۳ھ امام باجی اندلسی المتوفی سنہ ۴۷۴ھ قاضی عیاض المتوفی سنہ ۵۴۴ھ قاضی ابوبکر بن العربی المتوفی سنہ ۵۴۳ھ، اور متاخرین میں حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ علامہ زرقانی مصری المتوفی سنہ ۱۱۲۲ھ شاہ ولی اللہ الدہلوی المتوفی سنہ ۱۱۷۶ھ وغیرہ داخل ہیں۔

امام خطابی، حافظ سیوطی، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابوالولید باجی نے مؤطا کی بحذف فتاوےٰ صرف احادیث کی تلخیص کی ہے، حافظ سیوطی نے رجال مؤطا کو علیحدہ کیا ہے۔ احمد بن عمران اخفش بصری اور قاضی عیاض نے مؤطا کے لغات حل کیے ہیں، باجی اور دارقطنی نے مؤطا کی صرف متصل الاسناد حدیثیں جمع کی ہیں، ابن بشکوال اور خطیب بغدادی نے صرف ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں، جنہوں نے امام سے مؤطا کی روایت کی ہے۔

آئندہ صفحہ پر ان لوگوں کی فہرست نقل کرتا ہوں، جنہوں نے موطا کے متعلق کوئی خدمت انجام دی ہے۔

مؤطا کی شروح، تجریدیں، اسناد، رجال وغیرہ

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
شرح	ابومروان بن عبد الملک بن حبیب مالکی المتوفی سنہ ۲۳۹ھ	مؤطا کی سب سے قدیم شرح ہے
التمہید لمانی المؤطا من المعانی والاسانید	حافظ بن عبدالبر قرطبی المتوفی سنہ ۴۶۳ھ	مؤطا کے معانی کی تشریح اور اس کے اسانید کی تحقیق اور اس ضمن میں فقہ وحدیث کے بیشمار معلومات ہیں۔ اس کی ترتیب رواۃ کے نام پر ہے۔ بترتیب ہجا خود
الاستذکار		مصنف نے اپنی کتاب کا اختصار کیا ہے۔
المنتقیٰ۔ الایماء۔ الاستیفاء	ابوالولید سلیمان الباجی المتوفی سنہ ۴۷۴ھ	یہ تین شرحیں ہیں جو ایک ہی شارح کے قلم سے ہیں۔
	ابن رشیق قیروانی المتوفی سنہ ۲۵۶ھ	ابن عبدالبر کی تمہید کا اختصار
الانتقاء	شیخ زین الدین عمر جلی	" "
شرح مؤطا	ابن ابی صفرہ	شرح
"	القاضی ابوعبداللہ	"

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
شرح موطا	ابوالولید بن العود	شرح
	ابوالقاسم بن الجد الکاتب	
	ابو الحسن الاشبیلی	
	ابو عمر العلیطلی	
القبیس	قاضی ابوبکر بن العربی الغربی المتوفی سنہ ۵۴۶ھ	
المقتبس	ابو محمد عبداللہ بن محمد بطلیوسی المتوفی سنہ ۵۲۱ھ	
الموعب	ابوالولید بن صفار	
المستقصی	یحییٰ بن مزین	
القرب	محمد بن زمنین	
المسالک	ابوبکر بن سابق الصقلی	
شرح موطا	قاضی محمد بن سلیمان بن خلیفہ	
کشف المغطاعن الموطا	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ	
تنویر الحوالک علی موطا مالک	〃	
تجرید حدیث موطا	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ	موطا کی صرف حدیثیں جمع کی ہیں
شرح زرقانی	محمد بن عبدالباقی زرقانی مالکی المتوفی سنہ ۱۲۲ھ	یہ شرح تین جلدوں میں ہے

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
شرح موطا	بیری زادہ حنفی مفتی مکہ	شرح (مقدمہ موطا امام محمد از مولینا عبدالحیٰ)
شرح موطا	شیخ علی قاری حنفی	" " "
المصفیٰ	شاہ ولی اللہ دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ	تعلیق بر موطا عربی زبان میں ہے اختلافِ فقہا کی تفصیل ہے۔
المسویٰ	" "	فارسی میں موطا کی مجتہدانہ شرح ہے۔
المجلی[1]	شیخ الاسلام حنفی دہلوی الموجود ۱۲۵۲ھ	نہایت محققانہ شرح ہے، خاص مصنف کا نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے، پہلے صفحہ پر "الفضل الکبیر" مادہ تاریخ ہے۔

تجرید و اسناد

مسند احادیث الموطا	ابوالقاسم عبدالرحمٰن الغافقی المصری المتوفی ۳۸۱ھ	موطا کی احادیث مسند و متصل انتخاب و ترتیب و بیان
ملخص موطا	امام ابوسلیمان الخطابی البستی المتوفی ۳۸۸ھ	"
التقصا بحدیث الموطا	ابن عبدالبر القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ	" "

---

[1] اس فہرست میں جہاں حوالہ نہ ہو اس کے لیے کشف الظنون لفظ موطا دیکھنا چاہیے اور تزئین الممالک صفحہ ۵۰ نقلاً عن المدارک للقاضی عیاض

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
المخلص	ابوالحسن علی بن محمد قابسی المتوفی سنہ ۴۰۳ھ	مؤطا کی احادیث مسند ومتصل کا انتخاب وترتیب وبیان
مسند المؤطا	قاسم بن اصبغ	
	ابوالقاسم الجواہری	
	ابوذر الہروی	
	ابوالحسن علی بن حبیب السلجماسی	
	المطرز	
	احمد بن قہرار	
	الفارسی	
	القاضی ابن المفرج	
	ابن الاعرابی	
	ابوبکر احمد بن سعید بن موضح الاخمیمی	
	ابوعمر الطلیطلی	مؤطا بروایت قعنبی کے احادیث وترتیب وبیان
	ابراہیم بن نصر المسر قسطی	〃 〃

۳۔ اختلاف المؤطاآت

اختلاف المؤطاآت	حافظ ابوالحسن الدار قطنی	مؤطا کے مختلف روایات اور نسخوں کی تحقیق وبیان

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
اختلاف المؤطاآت	ابوالولید سلیمان الباجی	مؤطا کے مختلف روایات اور نسخوں کی تحقیق وبیان

۴۔ رجال المؤطا

رجال المؤطا	قا ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ الحذاٗ	موطا کے رجال ورواۃ کی تحقیق وحالات
	ابو عبداللہ بن المفرج	״
	البرقی	״
	ابو عمر الطلیطلی	״
اسعاف المبطا برجال المؤطا	حافظ جلال الدین سیوطی	״

۵۔ غریب المؤطا

غریب المؤطا	احمد بن عمران الاخفش	مؤطا کے لغات کی تحقیق
״	ابوالقاسم العثمانی المصری	״
״	البرقی	״
مشارق الانوار	قاضی عیاض	بخاری مسلم اور مؤطا کے لغات کی تحقیق

۶۔ رواۃ الموطا عن مالک

تسمیہ من روی الموطا عن مالک	ابوالقاسم بن بشکوال اندلسی	امام مالک سے جن لوگوں نے

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		مؤطا کی روایت کی ہے، ان کے حالات
رواۃ مالک	محدث خطیب بغدادی	"
	قاضی عیاض	"
الحاب السالک برواۃ الموطا عن مالک	حافظ شمس الدین دمشقی	،

۷۔ متفرقات

التقصی	ابن عبد البر اندلسی	مؤطا کے منقطع، مرسل، منعضل بلاغات کا وصل و رفع و اسناد
اطراف الموطا	ابوبکر بن ثابت الخطیب	
توجیہ الموطا	ابو عبد اللہ بن عیشون الطلیطلی	
السافر عن آثار الموطا	عازم بن محمد بن حازم	مؤطا کے آثار کی تحقیق و بحث ۴۰ جز میں
تاج الحلیہ	ابو محمد بن یربوع	مؤطا کے اسانید پر تحقیق و بحث
جمع الموطا	ابن جوصا	شاید مؤطا کے مختلف نسخوں کا مجموعہ
مشائخ مالک	امام مسلم	امام مالک کے اساتذہ، حدیث کے حالات

---

[1] یہ تمام فہرست کشف الظنون لفظ موطا اور مدارک قاضی عیاض سے بواسطہ تزیین الممالک سیوطی صفحہ ۵۴ ۔ ۵۰ سے ماخوذ ہے۔

مُوطا کا ایک اور امتیاز

گو سلاطین اور خلفائے اسلام میں ہزاروں اشخاص ایسے گذارے ہیں۔ جو صاحب سیف و قلم تھے تخت و و منبر دونوں ان کے نام سے عزت پاتے تھے۔ لیکن کسی کے متعلق یہ بیان نہیں ہے۔ کہ اس نے طلب علم و اخذِ سند کے لیے کوئی سفر اختیار کیا ہو۔ گو خود ان کا قصر اساتذہ کا مرکز اور علمائے عہد کا مرجع ہوتا تھا۔ لیکن تنہا مُوطا وہ کتابِ مقدس ہے۔ جس کے لیے مہدی۔ ہادی۔ رشید مامون اور امین مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک بادیہ پیمائی کی، اور آخر میں چھٹی صدی میں بزرگترین سلاطین اسلام صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔

امام شافعیؒ

ولادت ؁۱۵۰ھ

وفات ؁۲۰۴ھ

خصوصیات

- سلسلۂ نسب ذات رسالت پناہی سے ملتا ہے، ہاشمی اور مطلبی تھے ۔
- فن حدیث میں یکتا تھے، فقہ میں یگانہ ان کی "کتاب الام" مغز و معنیٰ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے ۔
- حق کے راستہ میں تکلیفیں اٹھائیں، مصیبتیں جھیلیں، دُکھ سہے، لیکن پیشانی پر شکن نہیں آئی ۔
- بہت بڑے مناظر بھی تھے، احقاق کے لیے دیار و امصار کے چکر کاٹے بڑے بڑے لوگوں سے مناظرے کیے ۔
- ان کا مذہب کچھ عرصہ تک مصر کا سرکاری مذہب رہا، اب بھی بہت زیادہ شافعی مصر ہی میں ہیں ۔

ولادت عہدِ طفولیت تربیت

نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب ناصر الحدیث، شافعی ان کے جدِ اعلیٰ شافع کی جانب نسبت ہے۔

سلسلہ نسب یہ ہے۔ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافعی بن سائب بن عبید بن عبد بن ہاشم بن عبد المطلب، بن عبد مناف القریشی الہاشمی، المطلبی، ساتویں پشت پر جا کر سلسلۂ نسب حضور علیہ السلام سے مل جاتا ہے۔ نسبی اعتبار سے اس سے زیادہ شرافت کیا ہو سکتی ہے۔ علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی والدہ کو ہاشمیہ کہا ہے :۔

لیکن یہ صحیح ہے، کہ آپ کی والدہ قبیلہ ازد سے تھیں جو یمن کا ایک ممتاز و مشہور قبیلہ ہے دادھیال کی طرف سے آپ کا نسب ممتاز ترین ہے۔ یعنی آپ قریشی ہاشمی مطلبی ہیں۔

آپ کے والد ادریس بن عباس مدینہ منورہ کے قریب ایک قصبہ "تبالہ" کے رہنے والے تھے، پھر مدینہ منورہ چلے آئے، معاشی کش مکش کی وجہ سے شام پہنچے اور عسقلان میں سکونت پذیر ہوئے، حضرت امام کے جد امجد شافع اور ان کے والد صحابی تھے۔

السائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم
بن مطلب بن مناف المطلبی جد امام
الشافعی رضی اللہ عنہ ذکر الخطیب فی
ترجمہ الشافعی بغیر اسناد ان السائب
اسلم یوم بدر دکان صاحب رایۃ نبی
ہاشم معی المشرکین فاسر فقد انفسہ واسلم

سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن مطلب
بن عبد مناف مطلبی امام شافعی رضی اللہ عنہ
کے دادا ہیں، خطیب نے بغیر سند کے امام
شافعی کے تذکرہ میں بیان کیا ہے، کہ بدر کے
معرکہ کے سلسلہ میں سائب ایمان لائے
یہ مشرکین کے ساتھ بنی ہاشم کے علمبردار

قال البیہقی فالسائب بن عبید صحابی وابنہ شافع صحابی واخوہ عبداللہ بن السائب صحابی[1]۔

تھے، یہ گرفتار ہوئے انہوں نے اپنا زر فدیہ ادا کیا۔ پھر اسلام لائے۔ بیہقی نے فرمایا ہے، کہ سائب بن عبید صحابی ہیں۔ اور ان کے بیٹے شافع صحابی ہیں اور ان کے بھائی عبداللہ بن السائب صحابی ہیں۔

ولادت

آپ بمقام غزہ رجب ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا انتقال آپ کے پیدا ہونے سے کچھ دن قبل ہو چکا تھا، آپ فرماتے ہیں۔

وُلِدتُ بِغَزَّةَ وَحَمَلَتْنِی اُمّی اِلیٰ عَسْقَلَان[2] میں غزہ میں پیدا ہوا پھر میری والدہ مجھ کو عسقلان لے گئیں۔

طفولیت

باپ کا سایہ ولادت سے پہلے ہی اُٹھ چکا تھا۔ اس لیے آپ کی والدہ نے مدت رضاعت ختم کر کے دو سال کے بعد اپنے قبیلہ اور نواح یمن کا سفر کیا اور آپ نے اپنے ماموں کے پاس کامل آٹھ سال گذارے وہیں آپ نے سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور دس سال کی عمر میں مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ کو حفظ کیا۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر

آپ فرماتے ہیں، میں نے خواب میں حضور علیہ السلام کو دیکھا، آپ نے مجھ سے فرمایا اے لڑکے تو کس خاندان سے ہے، میں نے عرض کیا حضور کے خاندان سے فرمایا، میرے قریب آ، جب میں آپؐ کے قریب پہنچا، آپؐ نے اپنا لعاب دہن میری زبان پر ہونٹوں پر اور منہ میں ڈال دیا پھر فرمایا جا خدا تجھ پر برکت نازل فرمائے، آپ فرماتے ہیں میں نے اسی عمر میں پھر حضور علیہ السلام کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھاتے دیکھا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کو تعلیم دیتے رہے، پھر میں بھی آپ کے قریب پہنچا اور آپؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بھی

---

[1] اصابہ فی معرفۃ الصحابہ [2] توالی التاسیس لابن حجر۔

کچھ سکھایئے، آپ نے اپنی آستین سے میزان (ترازو) نکال کر عطا فرمائی اور فرمایا تیرے لئے میرا یہ عطیہ ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں: میں نے ایک معبر سے اس کی تعبیر دریافت کی، اس نے کہا کہ تم دنیا میں حضور علیہ السلام کی سنت مطہرہ کی نشر و اشاعت میں امام بنو گے[1]

تعلیم و تربیت

جب آپ نے زندگی کی دس بہاریں دیکھ لیں تو والدہ نے مکہ مکرّمہ آپ کے چچا کے پاس بھیج دیا تاکہ شہر میں رہ کر علم الانساب حاصل کریں۔ اس لیے عرب میں نسب کا محفوظ رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ آپ کے چچا کی مالی حالت کمزور تھی بدیں وجہ آپ کو علم حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آتی رہیں۔ آپ ایک ماہر انساب کے پاس گئے۔ اس نے آپ کو مشورہ دیا کہ پہلے کوئی ذریعہ معاش پیدا کرو پھر علم سیکھنا۔ آپ فرماتے ہیں۔ میرا تو یہ حال تھا کہ تعلیم کی جانب دل مائل تھا۔ جب کسی عالم سے کوئی حدیث یا مسئلہ سنتا فوراً یاد کر لیتا اور ہڈیوں پر لکھ لیا کرتا اور ان ہڈیوں کو مٹکے میں بڑی احتیاط سے محفوظ کر دیتا۔ بالآخر آپ کو معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں مسلم بن خالد زنجی فقہ و حدیث کے امام اور مفتی مکہ ہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے محمد بن شہاب زہری، عمرو بن دینار اور ابن جریج مفتی مکہ سے استفادہ کیا ہے ۔آپ ان کے پاس پہنچے۔ مسلم بن خالد زنجی بڑے جوہر شناس تھے، امام صاحب کی ذہانت، ذکاوت اور قوتِ حفظ کی وجہ سے بے حد مانوس ہو گئے۔ کامل تین برس تک ان سے فقہ و حدیث کی تکمیل کی انہیں کی مجلس میں اکثر و بیشتر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے آپ کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کا شوق پیدا ہوا اپنے استاد مسلم بن خالد سے مدینہ منورہ جانے کا خیال ظاہر کیا۔ انہوں نے فوراً ایک سفارشی خط امام مالک علیہ الرحمۃ کے نام لکھ دیا کہ جس نوخیز کو میں خدمتِ اقدس میں بھیج رہا ہوں۔ وہ آپ کی فیوض و برکات سے مستفیض ہونے کا واقعی مستحق ہے۔ اور اس میں غیر معمولی صلاحیتیں موجود ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے

---

[1] الکمال

پاس زادِ راہ نہ تھا۔ نہ چچا کے پاس اس قدر سرمایہ تھا کہ وہ کچھ امداد کرتے۔ اس لیے آپ نے مصعب ابن الزبیر سے اپنی ضرورت کو بیان کیا۔ انہوں نے کسی شخص سے سفارش کر دی اور اس نے بطور امداد سو دینار پیش کر دیئے۔ دینار ملتے ہی آپ نے انتظام کیا اور مدینہ منورہ چند روز میں پہنچ گئے، وہاں پہنچتے ہی پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر حاضر ہوئے، دستک دی، اندر سے خادمہ آئی۔ نام پوچھ کر گئی، پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور بڑے اخلاق سے گفتگو فرمائی، آپ نے مسلم بن خالد زنجی کا خط پیش کیا۔ امام مالکؒ نے خط پڑھ کر پھینک دیا اور فرمایا سبحان اللہ کیا حضور علیہ السلام کا علم اب اس قابل رہ گیا ہے۔ کہ وہ وسائل اور رسائل کے ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا غصہ دیکھ کر امام شافعی، رحمۃ اللہ علیہ نے معذرت پیش کی اپنی بے نوائی اور ذوقِ علمی کو پیش کیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ تقریر سن کر متاثر ہوئے اور سر سے پیر تک آپ پر نظر ڈال کر پوچھا۔ ما اسمك تمہارا نام کیا ہے۔ آپ نے کہا محمد ابن ادریس، فرمایا۔

اتق اللہ فیسکون لك شان

یعنی خدا سے ڈرتے رہنا۔ عنقریب تمہاری شان بڑی نمایاں ہو گی۔

تعلیم، شیوخ اور اساتذہ جامع علوم و فنون

مختلف شیوخ کے درس کا مختلف طریقہ یہ تھا، اکثر شیوخ کا یہ دستور تھا۔ کہ وہ خود کسی اونچی جگہ بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلبہ سامنے صف بستہ بیٹھتے، استاد پڑھتا جاتا یا روایت بیان کرتا، شاگرد اس کو لکھ لیتے تھے، لیکن مدینہ منورہ کے اکثر شیوخ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی احادیث، فتاویٰ و تعلیقات کو خود ہی لکھ لیتے تھے، اور کسی ذہین سمجھدار طالب علم کو دے دیتے تھے اور جب درس شروع ہوتا تو وہ شاگرد اس کو پڑھتا جاتا اور شیخ اس کی وضاحت کرتا رہتا، یہی طریقہ امام مالک کے درس میں تھا۔ ابن حبیب معن بن عیسیٰ، یحییٰ اکثر پڑھنے والے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں یحییٰ حدثنا و اخبرنا کے بجائے یہ کہتے ہیں، قرأت علی مالک یعنی میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پڑھا۔

امام صاحب کی مجلس درس بڑی باوقار ہوتی تھی، تمام طلبہ مؤدب بیٹھتے، مجمر (عود دان) میں بخور سلگتا رہتا۔ استاد و طلبا صاف ستھرے کپڑے پہن کر بیٹھتے تمام مجلس پر سکوت طاری رہتا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بکمال شفقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی قرأت کی اجازت عطا فرمائی، امام شافعی رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کا ورق بھی بہت آہستہ سے لوٹتے تھے، کہ کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکا ہوتا تھا۔

طلبا کا ہجوم، فتویٰ لینے والوں کی بھیڑ۔ امراء کی حاضری، علماء کا حاضر ہو کر فیضانِ نبوی حاصل کرنا، یہ سب باتیں دیکھنے والے پر رُعب طاری کر دیتی تھیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ نے ایسے جلیل القدر محدث و امام کی خدمت میں تقریباً تین سال صرف کیے، حدیث آثار صحابہ، تابعین کے فتاویٰ اور امام مالک رحمۃ اللہ کی فقہ کو

اچھی طرح پڑھا، سمجھا اور یاد کیا۔

چند اور شیوخ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مدینہ منورہ میں حضرت ابراہیم بن سعد انصاری، عبدالعزیز بن محمد درادردی، محمد بن اسمٰعیل فدیک، عبداللہ بن نافع الصائغ سے بھی بکثرت روائتیں اور آثار صحابہ اور ان کے فتاوی کو پڑھا۔ روایت حدیث کی جرح وتعدیل کے اصول وقواعد کی سمجھ کو محفوظ کیا۔

یوں تو امام مالک رحمۃ اللہ کو تقریباً دس ہزار روائتیں محفوظ تھیں، لیکن اس تعداد میں صحابہ کے اقوال وفتاوی اور تابعین کے اقوال ونیز مرسل وموقوف ومسند روائتیں شامل تھیں[1]۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے امام مالک رحمۃ اللہ کے فیضان سے یہ سب کچھ حاصل کیا اور متذکرہ بالا علماء مدینہ سے مزید آثار صحابہ ومسند روایتوں کے ذخیرہ کو اور صحابہ وتابعین کے اختلاف اقوال وفتاوی کو اچھی طرح سمجھ لیا اور محفوظ کیا۔

امام شافعی کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی

امام محمد بن جریر طبری سے روایت ہے کہ جب امام شافعی رحمۃ اللہ مدینہ منورہ میں تکمیل علوم کر چکے تو واپسی سے پہلے ایک دن آپ امام مالک کے حلقہ درس میں شریک تھے وہاں ایک شخص آیا اور امام مالک رحمۃ اللہ سے عرض کیا میں قمریوں کا تاجر ہوں، میں نے ایک شخص کے ہاتھ قمری فروخت کی اور یہ بھی کہا کہ قمری خوب بولتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جس نے قمری کو خریدا تھا واپس آیا اور کہنے لگا کہ یہ قمری تو نہیں بولتی اس دوران میں میری اور اس کی بحث شروع ہو گئی۔ دوران بحث میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ میری قمری کبھی خاموش نہیں رہتی اگر رہے تو میری بیوی کو طلاق ہے۔ اب فرمائیے میری بیوی کو طلاق تو نہیں ہوئی۔ امام مالک رحمۃ اللہ نے جواب دیا۔ تیری بیوی کو طلاق

---

[1] موطا امام مالک رحمۃ اللہ میں کل روائتیں ۱۷۲۰ ہیں۔ جن میں سے مسند مرفوع ۶۰۰، مرسل ۲۲۵ موقوف ۶۱۳۔ تابعین کے اقوال وفتاوی ۲۸۵ اور بلاغات امام مالک ۵ ہیں۔

ہو گئی ، وہ شخص رنجیدہ گھر واپس چلا گیا ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لئے تھوڑی دور پہنچ کر اس شخص کو آواز دے کر روکا ، اور پوچھا تیری قمری اکثر بولتی ہے یا اکثر چپ رہتی ہے ، اس نے کہا وہ اکثر بولتی ہے ، کبھی کبھی خاموش بھی رہتی ہے ۔ امام شافعی نے کہا مطمئن رہو تمہاری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی ، یہ جواب دے کر پھر امام مالک کے حلقہ میں آکر شریک ہو گئے ، وہ سائل پھر واپس آیا اور امام مالک سے کہا ۔ جناب والا ، میرے معاملہ میں پھر غور فرمایئے ، امام مالک رحمۃ اللہ نے پھر وہی جواب دیا ۔ سائل نے کہا کہ آپ کے حلقہ میں یہ نوجوان شخص شریک ہے ، اس نے ابھی مجھے مطمئن کر دیا کہ طلاق نہیں ہوئی ۔ اس پر امام مالک رحمۃ اللہ کو اور بھی غصہ آیا اور فرمانے لگے کہ کثرت و قلت کی یہاں کیا بحث ہے ، امام شافعی رحمۃ اللہ نے جواب دیا کہ آپ ہی نے مجھ سے بواسطہ عبید اللہ بن زیاد روایت بیان فرمائی ہے ، کہ فاطمہ بنت قیس ، حضور انور علیہ السلام کے پاس آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ معاویہ اور ابو جہم نے مجھے شادی کا پیغام بھیجا ہے ، اس لیے یہ عرض ہے کہ اب میں کس سے نکاح کروں ۔ آپ نے فرمایا معاویہ تو تنگدست ہے اور ابو جہم کبھی کاندھے سے لکڑی ہی نہیں اُتارتا ۔ حالانکہ حضور علیہ السلام خوب جانتے تھے کہ ابو جہم سوتا بھی ہے ، اور دوسری حاجتوں میں بھی مصروف رہتا ہے ، میں نے اندازہ کیا کہ حضور علیہ السلام کا منشائے مبارک یہ تھا کہ وہ اکثر کاندھے پر لکڑی رکھے رہتا ہے ، اس بنا پر میں نے اُس کو یہ فتویٰ دیا کہ قمری چونکہ اکثر بولتی رہتی ہے ۔ اس لیے طلاق نہیں ہوئی ۔

امام مالک رحمۃ اللہ نے سائل سے فرمایا ، ہاں بھائی جاؤ ۔ واقعی طلاق نہیں ہوئی ، شافعی کا استدلال معقول ہے ۔ امام شافعیؒ کی اس دقیقہ سنجی نے امام مالک سے یہ کہلوا دیا کہ اب تم میں فتویٰ دینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ۔ امام مالک و دیگر محدثین و فقہائے مدینہ نے متفقہ طور پر آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت عطا فرمائی ۔

مکّہ مکرمہ اور دوسرے مقامات کا سفر

پھر آپ مکہ مکرّمہ واپس آئے۔ مکہ میں چند دن ٹھہر کر اپنی نانہال یعنی قبیلہ ازد پہنچے اور پھر یمن میں قیام فرمایا۔ قبیلہ ہزیل تمام قبائل عرب میں اپنی زبان کی شستگی اور فصاحت میں مشہور تھا۔ وہاں رہ کر آپ نے مختلف علوم وفنون کی تکمیل فرمائی۔ تیراندازی، فن لغت، فن تاریخ، علم الانساب، فن نحو، عروض اور علم فراست ان سب میں اس قدر کمال پیدا کیا، کہ نامآوران عرب نے آپ کو ماہر فن اور امام وقت تسلیم کر لیا۔

فنِ ادب و لغت میں مہارت تامہ

تیراندازی، عربی سپاہیانہ زندگی کا خاص جوہر تھا۔ اور اس دور کے نقطۂ نظر سے مذہبی عالم کو غازی بننا ضروری تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ اس فن میں ماہر تھے۔ آپ کو اپنی مہارت پر فخر تھا[1]۔ فن لغت میں بیس سال کی عمر تک آپ کوشش کرتے رہے۔ آپ نے ہزیل کے دس ہزار اشعار مع غرائب لغت کے حفظ کر لیے تھے۔

مبرّد جو ادب ولغت کے امام ہیں، کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا قول لغت میں حجت ودلیل ہے، جاحظ جو ادب کے ممتاز ترین فرد ہیں کہتے ہیں کہ امام شافعی کی تحریر سے بہتر میں نے کسی کی تحریر نہیں دیکھی۔ وہ عبارت کیا لکھتے ہیں، موتی پرو دیتے ہیں۔ ابو العباس تغلب فرماتے ہیں۔ کہ امام شافعی لغت کا خزانہ ہیں۔ اور وہ اس قابل ہیں کہ ان سے لغات کے معانی ومقاصد حاصل کیے جائیں۔ امام ابومنصور ازہر جو لغت کے امام ہیں۔ اور جن کی عربیت کے کمال پہ اجماع ہے۔ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کو اس علم میں کمال کا تبحر حاصل ہے انہوں نے امام شافعی کے محض محاورات کی شرح لکھی ہے اور دیباچہ کتاب میں اعتراف کیا ہے، کہ ان کے مثل ادب ولغت اور جاہلیت کے استعاروں کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ امام ابوسلیمان حناطی جو علم لغت کے ایک رکن تسلیم کئے گئے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ

---

[1] مناقب الشافعی (رازی)

علیہ کے شاگرد رشید ہیں، وہ فرماتے ہیں۔ کہ امام صاحب کی زبان شیریں اور تحریر دل آویز ہے۔ اور محاورات بے مثال ایسے استعمال کرتے ہیں۔ جن کو ہر شخص استعمال نہیں کر سکتا۔

علامہ زمخشری صاحب کشاف جن پر عربی علم و ادب کو ناز ہے لکھتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ ممتاز علماء میں سے ہیں۔ شریعت کے امام اور مجتہدین کے سرتاج ہیں، ان کا کلام اس کا مستحق ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ وہ صحت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں کبھی کسی غلطی کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ کلام عرب کے ماہر اور بڑی وسیع معلومات کے حامل ہیں، اتنی اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں۔ جن پر ایسے لغت کی تشریح مخفی نہیں رہ سکتی۔

امام رازی رحمت اللہ فرماتے ہیں کہ ماہرین لغت متفق ہیں کہ امام شافعی اس فن میں بھی سرتاج ائمہ لغت ہیں، اور یہ اس طرح تواتر سے ثابت ہے، جس طرح حاتم کی سخاوت اور حضرت علی کی شجاعت مسلمہ ہے۔ اسی طرح امام شافعی علم و ادب۔ لغت اور نحو میں ممتاز ترین فرد ہیں۔

فن تاریخ

علم اُدب خود ہی عرب کی ایک مفصل تاریخ ہے۔ جو شخص ایام العرب یعنی اشعار جاہلیت کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر ہو وہ مستقل مُورخ ہے۔ امام شافعی تاریخ مرأت الجنان میں فرماتے ہیں " دکان الامام الشافعی اعرف بالتواریخ یعنی امام شافعی فن تاریخ کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، امام شافعی و امام محمد بن الحسن کے مناظرات کا تذکرہ ہارون رشید تک پہنچا۔ رشید نے آپ کو بلایا اور آپ سے قرآن، حدیث، لغت، شعر و ادب اور طب کے متعلق سوالات کیے۔ آپ نے ہر بات کا مکمل جواب دیا۔ جب رشید نے عربی ادب و لغت کے متعلق دریافت۔ تو آپ نے یہ جامع جواب دیا مبدانا وطباعنا والنشتنا" عرب ہی کی خاک سے ہم پیدا ہوئے، اور یہی زبان ہماری رگ و پے میں سرائت کیے ہوئے۔ اور یہی ہمارے باپ دادا کی زبان ہے۔

آپ نے منازل شمس و قمر۔ رجوع۔ استقامت، سعد و نحس

[redacted]

امام شافعیؒ کی فراست کے متعدد واقعات حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے توالی التاسیس اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مناقب امام شافعی میں بیان فرمائے ہیں۔ ازاں جملہ یہ ہیں۔

(۱)

امام بخاری رحمت اللہ علیہ کے اُستاد امام حمیدی فرماتے ہیں۔ میں اور امام شافعی مکہ سے باہر چلے۔ ابطح میں ہم کو ایک شخص ملا۔ میں نے امام شافعی سے کہا فراست سے بتایئے کہ اس شخص کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ فرمایا یہ شخص بڑھئی یا درزی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس شخص سے جاکر پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ اُس نے کہا پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا لیکن آج کل درزی کا کام کر رہا ہوں۔

۲

آپ خود فرماتے ہیں کہ میں یمن سے جب علم فراست کی تکمیل کر کے واپس ہو رہا تھا۔ مجھے ایک قصبہ میں رات ہوگئی۔ میں متفکر تھا کہ کہاں ٹھہروں مجھے اُبھری پیشانی اور نیلی آنکھوں والا ایک شخص ملا جو اپنے گھر کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ تجربہ کے لحاظ سے ایسے شخص کو دنی الطبع خفیف الحرکات ہونا چاہیے تھا۔ تاہم میں نے اُس سے رات کے ٹھہرنے کے متعلق کہا۔ اُس نے بڑے اخلاق سے گفتگو کی اور ایک اچھے مکان میں مجھے ٹھہرایا۔ کمرے میں خوشبو سلگائی اور میرے لئے پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا۔ سونے کے لیے لحاف و بستر بھی عمدہ موجود تھا۔ میرے گھوڑے کے لیے گھاس اور دانے کا انتظام کیا۔ میں اس کی مہمان نوازی اور شریفانہ اخلاق سے بے حد متاثر ہوا اور سوچنے لگا کہ فراست کے اعتبار سے یہ شخص بالکل برعکس ہے۔ یا تو یہ علم ہی غلط ہے اور یا یہ شخص مستقبل قریب میں کوئی حرکت ضرور کرے گا۔ صبح کو جب میں نے روانگی کا ارادہ کیا اور اپنے خادم سے کہا کہ سواری تیار کر لو۔ سواری تیار ہوگئی تو میں اس شخص کا

بے حد شکر گذار ہوا اور میں نے کہا کہ اگر آپ کبھی مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو ذی طوی میں محمد بن ادریس کا مکان دریافت کر لیجیئے گا۔ اور وہیں تشریف لا کر قیام فرمایئے گا۔ اس نے جواب دیا یوں تو اخلاقاً میں آپ کا نیاز مند ہوں۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ کیا آپ کی کوئی امانت تو میرے پاس نہ تھی یا آپ نے کبھی مجھ پر احسان تو نہیں فرمایا تھا۔ میں نے کہا نہ میں نے آپ پر احسان کیا نہ میری کوئی امانت آپ کے پاس تھی۔ اس نے کہا حضرت یہ تو فرمایئے کہ میں نے رات کو جو راحت و آرام پہنچایا آپ کے خادم کا خیال کیا سواری کے گھاس دانے کا انتظام کیا، آخر اس کا معاوضہ کہاں ہے۔ میں نے اس معاوضہ کی تفصیل دریافت کی اس نے ہر ہر چیز کے معاوضہ کو بتایا۔ میں نے خادم سے اس کی بتائی رقم دلوا دی پھر میں نے پوچھا، اب تو کچھ باقی نہیں ہے۔ اُس نے کہا صرف مکان کا کرایہ باقی ہے میں نے وہ بھی دلوا دیا۔ اور مطمئن ہوا کہ واقعی علم فراست علم ہے۔

(۳)

امام حاکم نے محمد بن منذر بن سعید سے روایت کیا ہے۔ کہ میں نے ربیع سے سُنا وہ کہتے تھے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ ایک شخص میرے پاس آیا میں نے کہا کیا تم صنعا کے رہنے والے ہو۔ اس نے کہا ہاں پھر میں نے کہا لوہاری کا کام کرتے ہو۔ اُس نے کہا ہاں ـــ ربیع کہتے ہیں۔ مسجد جامع میں میرا بھائی امام شافعی رحمۃ اللہ کے سامنے سے گذرا، فرمایا۔ ربیع یہ تو تمہارا بھائی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں اس سے قبل آپ نے کبھی میرے بھائی کو نہیں دیکھا تھا۔

(۴)

امام بیہقی نے مزنی کے ذریعہ سے روایت کیا ہے۔ کہ میں مسجد جامع میں امام شافعی رحمۃ اللہ کے ساتھ تھا۔ اتفاقاً ایک آدمی آیا اور سوتے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے ربیع سے فرمایا۔ ربیع جاؤ تو سہی اور اس تلاش کرنے والے

سے کہو تمہارا حبشی غلام جس کی آنکھ میں نقص ہے۔ کیا گم ہو گیا ہے۔ ربیع نے اس شخص سے کہا۔ وہ ربیع کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ میرا غلام بتائیے کہاں ہے۔ فرمایا وہ تو قید خانہ میں ملے گا۔ وہ قید خانہ پہنچا، وہاں واقعی وہ مل گیا۔ مزنی نے امام صاحب سے عرض کیا۔ آپ نے ہم کو حیرت میں ڈال دیا فرمایئے تو سہی یہ کیا ماجرا تھا۔ فرمایا۔ یہ ڈھونڈنے والا جب مسجد میں آیا تو میں سمجھ گیا کہ کسی بھاگے ہوئے کو ڈھونڈھ رہا ہے۔ پھر یہ اس حصہ مسجد میں جہاں سیاہ فام سو رہے تھے۔ اور میں نے بغور دیکھا کہ یہ بائیں آنکھ والوں پر گہری نظر ڈال رہا ہے۔ اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ اس کا کوئی آنکھ کا عیب والا سیاہ فام غلام بھاگا ہے۔ میں نے ان باتوں کو سُن کر آپ سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ قید خانہ میں ہے فرمایا یہ میرا تجربہ ہے۔ کہ غلام جب بھُوکا ہوتا ہے۔ تو چوری کرتا ہے۔ اور اگر پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ تو زنا کرتا ہے۔ اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک ضروری ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ نکلا۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ جامع العلوم تھے۔ مجتہد تھے، محدث و مفسر تھے ادیب اور ماہر لغت تھے۔ نحو و بلاغت کے امام تھے۔ اور یہ تمام صفات بحیثیت مجموعی کسی مجتہد میں نہ تھیں۔

امام شافعیؒ کی گرفتاری اور رہائی ہارون الرشید کی غلط فہمی

آپ کے ابتلا کے زمانہ کے لیے ایک مختصر سی روئداد قابل لحاظ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حسنین علیہما السلام کے بعد ہاشمیوں کے مقابلہ میں جب اُمیہ نے نمایاں کامیابی حاصل کر لی تو بنو ہاشم جن میں بنو عباس اور بعض بنو فاطمہ اور عام علویین داخل تھے، خلافت ہاشمیہ کے قیام کی مخفی کوششوں میں مشغول تھے۔ امام حسین علیہ السلام کے بعد محمد بن حنیفہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے، امام نامزد کیے گئے۔ آپ کے بعد ابوہاشم عبداللہ علوی ان کے بعد محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس اس لیے نامزد کیے گئے کہ علاقہ شام میں کوئی ہاشمی نہ تھا۔ اس لیے خلافت کا ادعا خاندان علوی سے منتقل ہو کر خاندان عباس میں آگیا۔ محمد بن علی عباس کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے ابراہیم بن محمد امام تسلیم کیے گئے۔ ابراہیم مروان اموی کے ہاتھ گرفتار ہو کر مارے گئے۔ شیعہ عباسیین نے اس غم میں سیاہ کپڑے پہنے۔ ابراہیم کے بعد ابوالعباس سفاح بنو ہاشم کے سرخیل ہوئے ۱۳۲ھ میں یہ کامیاب ہوئے اور اب خلافت بنو ہاشم سے نکل کر بنو عباس میں منتقل ہو گئی۔

سادات پر عباسیوں کے مظالم

ایک طرف تو یہ نئے تاجدار بنو اُمیہ کے استیصال میں ان کی قبروں کی ہڈیاں اکھاڑ رہے تھے، دوسری طرف تخصیص خلافت سے بنو فاطمہ اور علوی بھی ان سے ناراض ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان کو ان نئے تاجداروں سے جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ سفاح نے تو کوئی نمایاں اقدام نہیں کیا۔ لیکن منصور نے احتیاط یا سوءظنی کی

بنا پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی۔ آخر تنگ آکر انہیں سادات میں سے ۱۳۵ھ میں محمد نفس ذکیہ نے مدینہ میں علم خود مختاری بلند کیا۔ اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی۔ بڑی بہادری سے میدانِ جنگ میں لڑ کر شہید ہوگئے۔ ان کے بھائی ابراہیم بھی ان کے بعد شہید ہو گئے ۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور مہدی اس کا جانشین ہوا۔ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی۔ اس کی جگہ موسیٰ ملقب بہادی تخت نشین ہوا۔ ایک برس خلیفہ رہا۔ پھر ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید خلیفہ ہوا اس زمانہ میں عبداللہ بن الحسن بن الحسین بن علی نے ہارون کے مظالم سے تنگ آکر مقابلہ کی تیاریاں کیں، غرضکہ عباسیوں کا دور بھی سادات کے لیے موجب عتاب و تکلیف ہی رہا ہے۔

نجراں کی گورنری

مکہ میں خلیفہ کا ایک والی آیا۔ اس سے عمائدین قریش نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سفارش کی کہ یہ شخص بڑا قابل، عالم، مدبر، مفکر اور سیاست کے اصول کا ماہر ہے۔ اس لئے کوئی سرکاری خدمت اس کے سپرد کی جائے۔ چنانچہ پہلے آپ ایک معمولی عہدے پر متعین کیے گئے زاں بعد آپ کی خداداد قابلیت و حسن کارگذاری کا جب عام شہرہ ہوا تو حسن خدمات کے صلہ میں ترقی دے کر آپ کو نجران کا والی بنا دیا گیا۔ نجران میں بنو حارث بن عبد المدان اور موالی ثقیف وہاں کے والی کو رشوت دیا کرتے تھے اور وہاں کا والی ہمیشہ ان کا لحاظ کرتا رہتا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کو بھی یہ نذرانہ پیش کیا گیا۔ آپ نے انکار کر دیا اور مقدمات کے فیصلے بغیر کسی اثر کے آپ فرماتے رہے۔ آپ کا مقدمات میں یہ طریقہ بھی تھا کہ بطور پنچایت وہاں کے سات معتمد اشخاص کی ایک کمیٹی بنا دیتے اور ان کے معمولی نزاعات کا خاتمہ اس کمیٹی کے ذریعہ ہو جاتا۔

آزاد فیصلوں نے وہاں کے لوگوں میں گرانی پیدا کر دی اور وہ مکہ میں درپردہ

سازشیں کرنے لگے۔

گرفتاری اور رہائی

یمن میں امام شافعی رحمۃ اللہ کا بڑا اثر تھا۔ اور یمن کے آس پاس کے افراد آپ کی طلاقت لسان، حسن بیان قوتِ استدلال، خوش خلقی، عالی نسبی اور جامع العلوم ہونے سے بے حد متاثر تھے، آپ دوسرے عمال کو بھی ہمیشہ رشوت ظلم، جانبداری اور کسی اثر کی وجہ سے فیصلے کرنے سے روکتے رہتے تھے۔ درپردہ وہ ایسے بد نفس عمال بھی آپ کے خلاف سازشوں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ مطرب جو ایک عامل کی حیثیت رکھتا تھا، اس نے بصیغۂ راز ہارون الرشید کو ایک عریضہ لکھا کہ اگر آپ یمن کی خیر چاہتے ہیں تو محمد ابن ادریس شافعی کو نکالیے اور سزا دیجئے۔ اس شخص کا یہاں بڑا اثر ہے۔ ادھر ملک میں سادات کا خاندان پھر خلافت کا خواب دیکھ رہا ہے اور شافعی چونکہ خود ہاشمی ہے، اس لیے قرینہ یہ ہے، کہ ان کی اعانت بھی درپردہ سادات کو حاصل ہے۔ یہ خط جب ہارون رشید کو پہنچا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ فوراً میر منشی کو بلوایا اور حماد بربری کے نام بصیغۂ راز فرمان لکھوایا کہ محمد ابن ادریس شافعی اور تمام سادات کو گرفتار کر کے فوراً دارالخلافہ بھیج دو۔ چنانچہ حماد نے فرمان پہنچتے ہی تعمیل کی، تمام سادات کو مع حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ گرفتار کر کے رقہ ہارون رشید کے پاس بھیج دیا۔ رشید نے حکم دیا کہ دس دس سید روزانہ قتل کرتے رہو۔ چنانچہ رشید کے سامنے روزانہ دس شہید کیے جاتے۔ ایک دن آپ کی باری آئی۔ آپ نے ایسی موثر اور پُر درد تقریر فرمائی جس سے رشید کانپ اٹھا اور اس نے آپ کے قتل کے حکم کو منسوخ کرتے ہوئے آپ کو حراست میں رکھے جانے کا حکم صادر کیا۔ اسی اثنا امام شافعی کے ایک علمی مباحثہ کی تفصیل خلیفہ ہارون رشید کے گوش گذار ہوئی۔ ہرثمہ بن اعین کا بیان ہے، کہ ہارون رشید تکیہ پہ سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ جس وقت اس نے امام شافعی کے دلائل سنے تو اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس مقرب

شخص سے کہا اس کو پھر سناؤ، پھر سن کر کہنے لگا، واقعی محمد بن ادریس محمد بن حسن سے زیادہ عالم ہیں، ہرثمہ سے کہا پانچ سو دینار شافعی کو نذر کرو۔ اور ان کو حراست سے چھوڑ دو ہرثمہ بن اعین نے اپنی طرف سے پانچ سو دینار ملا کر ایک ہزار دینار امام شافعی کے نذر کیے اور پیام پہنچایا کہ خلیفہ آپ کی قوتِ استدلال و تبحر سے بے حد خوش، اور آپ پر سے نگرانی اٹھا دی گئی۔

شان استغنا، جلال، علم، وقار و تمکین، عزیمت و استقامت

ہر اچھے کام کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے، کہ ضمیر کا احساس بیدار ہو اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو یہ تقویٰ ہے، پھر اس کام کو خدائے ذوالجلال والاکرام کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ "اخلاص" ہے اور اس کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت و حمایت پر بھروسہ رہے تو یہ "توکل" ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ میں تاخیر ہو تو دل میں استقامت ہو اور خدا سے آس نہ ٹوٹنے پائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے یہ "صبر" ہے۔ اور اگر کامیابی کی نعمت سے سرفرازی ہو تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اُس کو خدا کا فضل و کرم سمجھتے ہوئے اور جسم و جان و زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور بھی زیادہ انہماک ہو یہ "شکر" ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں یہ تمام صفات ایمانی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

قناعت

آپ خود ہی فرماتے ہیں کہ میں نے بیس سال سے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ میں نے طمع و لالچ کو کبھی پاس نہ آنے دیا۔ اس کی بدولت مجھے ہمیشہ آرام پہنچا۔ اور اسی وجہ سے ہمیشہ میری عزت ذلت سے محفوظ رہی۔ فرمایا کرتے تھے کہ حرص و طمع وہ برائی ہے، جس سے نفس کی دنائت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصاً ایسی حرص جس میں بخل کی آمیزش بھی ہو۔ اسی کو عرب "شح" کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کی برائی متعدد جگہ آئی ہے۔ فرماتے تھے خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ گھر کا مالک

زیادہ نہیں چاہتا، اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔ شوہروں کو مال سے محبت ہوتی ہے اور بیویاں لالچ سے زیادہ مانگتی ہیں۔ اس سے خانگی معاملات میں کش مکش ہو جاتی ہے اور گھر روحانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن کی اس آیت کو اچھی طرح سمجھو جس میں مسلمانوں کا وصف یہ ہے۔ کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔

وَیُؤثِرُونَ علیٰ انفسھم ولو کان	اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں
بہم خصاصہ وَمن یُّوقَ شح نفسہٖ	اگرچہ خود ان کی ضرورت ہو اور جو اپنے
فاُولٰئکَ ھم المفلحون۔ (حشر)	جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

ہارون رشید نے ایک مرتبہ بے حد اصرار کیا کہ آپ جس شہر کو پسند کریں میں وہاں کا قاضی مقرر کر دوں۔ جواب دیا مجھے تو اس عہدے سے معاف ہی رکھئے۔

سخاوت

آپ نے فرمایا سخاوت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے کسی حق کو یا کسی شئے کو خوشی کے ساتھ بغیر کسی اکراہ کے دوسرے کو حوالہ کر دیا جائے اور اس کی یہ چند صورتیں ہیں۔

اپنا حق کسی کو معاف کر دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی کی ضرورت پوری کرنا۔ دوسرے کے لیے اپنے دماغ کو خرچ کرنا۔ دوسرے کی اعانت کے لیے اپنی عزت کو خطرہ میں ڈال دینا یا اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا۔ دوسروں کو بچانے کے لیے خود کو پیش کر دینا۔ فرماتے ہیں۔ کسی شخص کو کبھی نکمی و ناکارہ چیز نہ دیا کرو اس کے دینے سے نفس کی بلندی زائل ہو کر دنائیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ خدا نے فرمایا ہے۔

یا ایھا الّذین اٰمنوا انفقوا	اے ایمان والو! اس میں سے جو تم نے کمایا ہے
من طیبات ما کسبتم	اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین
ومما اخرجنا لکم من الارض	سے نکالا ہے۔ اچھی چیزیں خرچ کرو۔ اس

ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون
ولستم بآخذیه الا ان تغمضوا
فیه ۔ بقرہ (۳۷)

میں سے بُری چیز کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرو، حالانکہ تم آپ اس کو لینے والے بھی نہیں ہو، مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو (بند کرلو)

ابتدا میں آپ تنگدستی سے بسر کرتے تھے، مگر تعلیم حاصل کر لینے کے بعد خدائے کریم ورحیم نے ہر قسم کی نعمتوں سے آپ کو ممتاز فرما دیا تھا۔ اکثر خلیفۂ وقت، امرا و وزراء اور اہل دولت آپ کو نذر پیش کرتے رہتے تھے۔ اور ہر شخص اس نذر کے قبول کرنے میں اصرار کرتا رہتا تھا۔ ایک بار ہارون رشید نے آپ کو پچاس ہزار درہم نذر کیے ان میں سے آپ نے چالیس ہزار غربا، یتامیٰ، بیوگان اور نادار علماء پر صرف کر دیئے، ابوحسان زیادی نے ایک مرتبہ چھ ہزار دینار، جعفر بن یحییٰ برمکی نے ایک ہزار دینار اور پھر ہارون رشید نے کئی ہزار دینار بھیجے، مگر آپ کا معمول یہ تھا کہ بسا اوقات صرف ایک چوتھائی اپنے لیئے رکھ کر باقی رات کی تاریکی میں غریب و معذور علماء و فقہا و نادار طلباء، بیوگان و یتامیٰ کو تقسیم فرما دیتے اور پھر خدا سے دعا کرتے الٰہی! مجھے حرص دنیا سے ہمیشہ محفوظ رکھنا۔

امام مزنی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں، میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ سے بڑھ کر نہ کوئی کریم دیکھا نہ کوئی سخی دیکھا، ایک بار عید کی رات تھی میں ان کے ساتھ مسجد سے گھر کی طرف چلا راستہ میں ایک مسئلہ پر گفتگو جاری رہی۔ ان کے مکان پر ایک غلام کھڑا تھا اس نے سلام کیا اور عرض کیا کہ میرے آقا نے یہ روپیوں کی تھیلی بطور نذر پیش کی ہے اور سلام عرض کیا ہے فرمایا، میرا سلام کہہ دینا اور شکریہ ادا کر دینا، عین اس وقت ایک شخص آیا اور کہنے لگا ابوعبداللہ میرے یہاں ابھی بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ آپ نے وہ تھیلی فوراً اس کو دے دی اور ہنستے ہوئے گھر میں چلے گئے۔

ایک مرتبہ عید کے دن گھر میں کھانے پینے کا مناسب سامان نہ تھا۔ آپ کی بیوی نے

کہا۔ آپ تو اپنی قوم کے ساتھ بڑی صلۂ رحمی کرتے رہتے ہیں آج عید ہے اور گھر میں سامان نہیں ہے۔ اس لیے کسی سے قرض ہی منگا لیجیۓ۔ آپ نے ایک شخص سے ستر دینار قرض منگائے۔ فقراء اور مساکین نے گھیر لیا۔ ۵۰ دینار ان کو تقسیم کر دیئے ۲۰ دینار لے کر گھر میں گئے۔ ابھی وہ دینار بیوی کو دینے بھی نہ پائے تھے۔ کہ ایک قریشی نے گھبرا کر پکارا۔ آپ فوراً آئے، پوچھا خیر تو ہے۔ اس نے رو کر اپنا حال سنایا۔ آپ نے وہ بیس دینار سامنے رکھ دیئے۔ کہ بھائی اس میں سے جس قدر چاہو لے لو۔ اُس نے سب اٹھا لیے اور بولا کہ ابھی تو مجھے اور ضرورت ہے۔ آپ بیوی کے پاس پہنچے اور سارا قصہ سنایا۔ بیوی نے کہا آپ یہی کرتے رہتے ہیں۔ رات ہوئی خاموشی سے سب سو گئے۔ صبح کو جعفر بن یحییٰ برمکی وزیر ہارون رشید کا ایک قاصد آیا اور آپ کو بُلا کر ساتھ لے گیا۔ جعفر نے آپ کی بے حد تعظیم کی اور آپ سے کہا کہ آج رات خواب میں ہاتف غیبی نے مجھے آپ کا واقعہ بتایا ہے اس لیے آپ بھی اب سنا دیجیۓ۔ فرماتے ہیں میں نے اپنا واقعہ سنایا۔ جعفر نے ایک ہزار دینار نذر کیے اور اصرار کیا کہ اس کو قبول کر ہی لیجیے۔ چنانچہ آپ نے وہ دینار قبول فرما لیے۔[1]

تواضع

فرماتے تھے کہ تواضع کا حکم اس لیے دیا گیا ہے۔ تاکہ کوئی شخص اپنی قوت و دولت کا بیجا استعمال نہ کرنے پائے۔ جس سے غریبوں اور غیر مستطیع لوگوں کا دل دُکھے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ خدا نے مجھ پر وحی نازل فرمائی کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی شخص کسی پر ظلم نہ کر سکے اور کسی کو کسی کے مقابلہ میں فخر کرنے کی جرأت نہ پیدا ہو۔" تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے۔

آپ نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کی تواضع کے لیے ایک کنیز کو مقرر کر رکھا تھا۔ وہ حلوا بنانے میں کمال رکھتی تھی۔ آپ اس سے حلوا بنوا کر اکثر و بیشتر ملنے جلنے

---

[1] مناقب الشافعی الرازی

والوں کو کھلاتے اور انتہائی محبت آمیز لہجہ سے گفتگو فرماتے۔ احباب کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص معمولی احسان بھی کرتا تو علاوہ شکر گزاری کے اس کے ساتھ اس سے زیادہ احسان فرمادیتے۔ اگر کسی شخص سے معمولی سی خدمت بھی لیتے تو اس کو دونی تگنی اُجرت عنایت فرماتے تھے۔

باکمال اشخاص کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک بار کہیں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص تیراندازی کی مشق کر رہا ہے۔ آپ کے سامنے اس کا تیر صحیح نشانہ پر پہنچا آپ نے اپنی جیب سے اس کو تین دینار نذر کیے اور اظہار افسوس کیا کہ کاش اور دینار ہوتے تو میں تم کو اور دے دیتا۔

اتباعِ سُنّت

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ جو آپ کے شاگردِ خاص ہیں، فرماتے ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے جواب دے کر اس کے ثبوت میں ایک حدیث بھی بیان فرمائی۔ اس شخص نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ بھی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ آپ کو بے حد غصہ آیا اور فرمانے لگے۔ کیا تم نے مجھے بت خانہ سے نکلتا دیکھا یا میرے گلے میں زنار دیکھی۔ جو صحیح حدیث سے ثابت ہے، وہی میرا مذہب ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ کا اصول یہ تھا۔ کہ اگر ان کو اپنے فتوے کے خلاف کوئی صحیح حدیث پہنچ جاتی تو فوراً علانیہ فرما دیتے کہ میں اپنے فتوے سے رجوع کرتا ہوں۔

امام مزنی و ربیع بن سلیمان اور دوسرے شاگردوں سے ہمیشہ یہ فرماتے رہے۔ کہ میں نے جتنی تصانیف لکھی ہیں۔ ان میں بحد امکان احتیاط و حزم سے دلائل کو لکھ دیا ہے تاہم میں انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ان میں غلطیاں ہوئی ہوں۔ غلطی سے منزّہ تو خدا کا کلام ہے۔

اس لیے کوئی بھی مسئلہ میری کتابوں میں اگر خلاف کتاب و سنت ہو۔ اور تم اس کو دیکھو تو خوب سمجھ لینا کہ میں نے اس سے رجوع کر لیا ہے، یہ یاد رکھو کہ اگر صحیح حدیث مجھ تک پہنچے اور پھر میں اس پر عمل نہ کروں تو میری عقل میں فتور آ چکا ہے۔

آپ کو کبھی اپنی رائے یا بات پر اصرار نہیں رہتا تھا۔ اگر کسی مسئلہ میں غلطی ثابت ہو جاتی تو فوراً رجوع فرما لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے اکثر فرمایا کرتے تھے تمہاری نظر احادیث صحیحہ پر مجھ سے زیادہ ہے۔ اس لیے میرے قول کے خلاف جب کسی صحیح حدیث کو دیکھو تو مجھے مطلع کر دو تاکہ اُس حدیث پر عمل کروں اور اپنی رائے کو نمایاں طور پر ترک کر دوں۔

آپ بے انتہا حق پسند تھے، آپ سے اکثر مناظرات و مباحثات ہوتے رہتے تھے۔ آپ فریق کو جواب بڑی نرمی و خندہ پیشانی سے دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے، میں نے کبھی کسی شخص سے اپنی بڑائی یا اظہار فضیلت کی بناء پر مباحثہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اعلائے کلمۃ الحق کا مقصد سامنے رہا۔

جھوٹ بولنے سے سخت نفرت تھی فرماتے ہیں میں نے مدت العمر میں کبھی جھوٹی بات نہیں کہی، نہ کسی معاملہ میں جھوٹی یا سچی قسم کھائی۔ اپنی تصانیف کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ خدا کرے کہ قوم ان کو سمجھے اور ان پر عمل کرے۔

بزرگوں کا ادب و احترام

کسی نے حضرت امام ابو حنیفہ کا تذکرہ کیا، فرمایا سنو، لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ کی اولاد ہیں۔ کسی نے امام سفیان بن عیینہ و امام مالک کے متعلق دریافت کیا، فرمایا، اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو حجاز سے علم حدیث ناپید ہو جاتا۔ جب امام مالک کا کوئی قول نقل کرتے تو فرماتے، ہذا قول استاذنا الامام مالک' یہ ہمارے اُستاد امام مالک کا قول ہے کسی نے پوچھا آپ نے امام مالک جیسا آدمی بھی دیکھا ہے، فرمایا ہماری کیا حقیقت ہے۔ جو علم اور عمل میں ہم سے

زیادہ ہیں۔ وہ یہی کہتے رہے۔ کہ امام مالک جیسا آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔

صحابۂ کرام کے متعلق فرماتے تھے۔ والصحابہ فوقنا فی کل علم واجتہاد وورع وعقل صحابہ ہم سے علم اجتہاد، تقویٰ اور علم میں بڑھے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے مسئلہ دریافت کیا کہ اگر کسی شخص نے کعبہ تک پیدل جانے کی نذر مانی اور پھر اس نذر کو وہ پورا نہ کر سکا تو کیا کرے۔ فرمایا قسم کا کفارہ ادا کرے اور ہم سے بہتر شخص حضرت عطاء بن ابی رباح نے بھی یہی کہا ہے۔

مجلس درس

صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک فقہ کا درس دیتے پھر حدیث کا درس شروع ہوتا۔ اس کے بعد مجلس وعظ ہوتی۔ پھر مذاکرات علمی ہوتے رہتے۔ ظہر کے بعد ادب شعر و شاعری، عروض نحو و لغت کا درس ہوتا رہتا۔ پھر عصر تک گھر پر آرام فرماتے۔

عصر سے لے کر مغرب تک ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔

رات کے تین حصے کرتے اور ایک تہائی رات میں سوتے اور دوسری تہائی میں کتابت حدیث و فقہ اور تیسری تہائی میں قرآن اور نوافل تا آنکہ صبح صادق ہو جاتی۔

تلاوت کلام اللہ کا بڑا شوق تھا۔ یوں تو معمولاً ایک قرآن مجید روزانہ پڑھتے رہتے تھے۔

حسین بن علی کرامیسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ میں آپ کے پاس تین مہینہ تک رہا۔ رات کا تہائی حصہ نوافل اور قرآن خوانی میں صرف فرماتے ہوئے میں نے دیکھا۔

محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکیم فرماتے ہیں۔ کہ ہم لوگ آپس میں زاہدوں اور متقیوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ان میں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ کا خاص طور پر تذکرہ ہوا۔ عمرو بن بنانہ بھی آ گئے انہوں نے کہا اے احباب کرام میری نظر میں تو امام شافعی رحمۃ اللہ سب سے بڑے زاہد عابد اور متقی ہیں۔ قرآن کی نشر و اشاعت میں مصروف۔ مکروہات دنیا سے علیحدہ، حکام و اُمراء سے بے نیاز رہتے۔ ایک مرتبہ میں اور حارث صالح مزنی کا غلام

امام شافعی کے ساتھ صفا پہ جا رہے تھے۔ اتفاقاً حارث نے یہ آیت پڑھ دی۔ ہذا یوم الفصل جمعنا کم والاولین۔ امام شافعی اس آیت کو سن کر کانپ اٹھے اور زار و قطار رونے لگے۔ ان پر خدا کا خوف غالب ہی رہتا تھا۔

ربیع بن سلیمان فرماتے ہیں۔ کہ امام شافعی کے ساتھ حج کو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہر نشیب و فراز پر روتے تھے۔ اور یہ شعر نہایت پُر درد لہجے میں پڑھتے تھے۔

ال النبی ذریعتی، وھم الیہ
وسیلتی ارجوا بان اعطی غدا
بیدی الیمین صحیفتی

اہل بیت رسول اللہ میرا ذریعہ ہیں اور بارگاہ خداوندی میں میرا وسیلہ ہیں۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ میرے داہنے ہاتھ میں مجھے اعمال نامہ دیا جائے گا۔

قرآن مجید ایسی خوش الحانی و عرب کے تمام لہجہ میں پڑھتے تھے کہ جب آپ امام ہوتے تو لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہو جاتیں تو آپ کو رکوع کرنا پڑتا اور جب کبھی آپ کسی مجلس میں قرآن مجید پڑھتے تو لوگوں کی ہچکی بندھ جاتی۔ بہت سے آدمی تو بے خود ہو کر گر جاتے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ آپ کی قرأت قرآن کی سند یہ ہے۔

قراء الشافعی القران علی اسمٰعیل بن قسطنطین وکان شیخ مکۃ وھو علی شبل بن عباد ومعروف مشکان وھما علی عباد اللہ بن کثیر وھو علی سید المفسرین عبد اللہ بن عباس وھو علی سید القرا ابی بن کعب وھو علی صاحب الوحی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فراست و ذہانت

قاضی یحیٰی بن اکثم فرماتے ہیں۔ میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ سے بڑھ کر کوئی عقلمند نہیں دیکھا۔ امام مزنی کا قول ہے۔ کہ اگر نصف اہل دنیا کی عقل اور امام شافعی کی عقل کو وزن کیا جائے تو امام شافعی

کی عقل سی وزنی نکلے گی۔

محمد بن الفضل البرازی راوی ہیں کہ ان کے والد فضل اور امام احمد بن حنبل حج کو گئے۔ اور دونوں ایک ہی جگہ ٹھہرے' امام احمد بن حنبل علی الصباح خاموشی سے حرم محترم چلے گئے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید حضرت سفیان بن عینیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شرکت مقصود ہو گی۔ اس لئے اتنے سویرے چلے گئے۔ میں بھی چلا اور حرم کی علمی مجلسوں میں اور حضرت سفیان بن عینیہ کی مجلس میں تلاش کیا تو نہیں ملے البتہ ایک نوجوان قریشی کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ اے ابو عبداللہ آپ نے سفیان بن عینہ کی مجلس چھوڑ کر یہاں کیوں نشست اختیار کی۔ حالانکہ وہ حضرت امام زہری و دیگر اکابر و تابعین کے ممتاز شاگرد ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے مجھ سے فرمایا۔ چپ رہو۔ اگر حدیث بسند عالی نہ ملے گی۔ نہ سہی حدیث صحیح بسند نازل تو ملے گی۔ (یعنی ایک واسطہ اور بڑھ جائے گا) لیکن اگر عقلمندی کی باتیں میں نے حاصل نہ کیں تو پھر قیامت تک ایسا انسان نہ مل سکے گا۔ کتاب اللہ کا سمجھنے والا اس جوان قریشی سے بڑھ کر میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا میں نے پوچھا ان کا کیا نام ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا۔ یہی محمد بن ادریس شافعی ہیں۔

امام حمیدی یعنی امام بخاری کے استاد فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ مکرمہ کے تمام مشائخ کو امام شافعی کی فہم و فراست' ذکاوت اور علم کی تعریف میں رطب اللسان ہی پایا۔ امام مالک رحمۃ اللہ تک یہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے پاس علم حاصل کرنے محمد بن ادریس شافعی قریشی سے زیادہ ذہین اور سمجھدار کوئی نہیں آیا۔

ابو عبید قاسم بن سلام کہتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی کی فصاحت و طلاقت لسان سے بڑے خوش تھے۔ خود امام شافعی فرماتے ہیں۔ کہ امام مالک کے سامنے قرأت کرنے والا بڑا جری اور قابل ہوتا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ تم پڑھا کرو۔

یں کچھ دیر پڑھ کر خاموش ہو جاتا تو وہ فرماتے کہ نہیں، ابھی اور پڑھو میرا حسن قرأت وافہام تفہیم کا طریقہ ان کو بے حد پسند تھا۔

امام شافعی کی جلالتِ شان کا اعتراف

ایک بار امام احمد بن حنبل، امام اسحٰق بن راہویہ، امام یحییٰ بن معین، مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور تینوں کا یہ ارادہ ہوا کہ امام عبدالرزاق محدث مکہ کے درس میں چلیں، جب یہ تینوں حرم محترم میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک نوجوان مسند پر جلوہ افروز ہے، اور اس کے پاس ایک ہجوم ہے، وہ نوجوان بڑی جرأت مندی سے یہ دعویٰ کر رہا تھا، کہ اے اہل شام و اے اہل عراق، مجھ سے حضور علیہ السلام کی احادیث کے متعلق جو چاہو دریافت کرو میں مطمئن کر سکتا ہوں۔ امام اسحٰق فرماتے ہیں، میں نے لوگوں سے پوچھا، یہ نوجوان کون ہے بڑا ہی بے باک و جرّی ہے۔ لوگوں نے کہا یہ محمد بن ادریس شافعی مطلبی ہیں، امام اسحٰق نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے کہا چلو ذرا اس شخص سے اس حدیث کا مطلب دریافت کریں، مکنوا الطیّور فی اوکارہم امام احمد نے فرمایا۔ اس حدیث کے معنی تو صاف ہیں، یعنی رات کے وقت پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں رہنے دو، لیکن خیر میں تمہارے کہنے سے پوچھے لیتا ہوں۔ امام احمد نے شافعی سے دریافت کیا کہ اس حدیث کا مقصد کیا ہے ہم نہیں سمجھے، امام شافعی نے فوراً جواب دیا کہ جاہلیت میں یہ قاعدہ تھا کہ رات میں اگر کسی کو سفر پیش آجاتا تو وہ پتھر مار کر گھونسلوں سے پرندوں کو اڑایا کرتا تھا۔ اگر وہ پرندہ داہنی طرف اُڑا تو لوگ یہ شگون لیتے تھے، کہ یہ سفر نیک ہوگا۔ اور اگر بائیں طرف اُڑا تو وہ شگونِ بد سمجھا جاتا تھا، حضور علیہ السلام جب مبعوث ہوئے اور آپ نے ان کی یہ نازیبا حرکت ملاحظہ فرمائی تو آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ سنو، پرندوں کو تو ان کے گھونسلوں میں آرام کرنے دو اور تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔ امام اسحٰق نے فوراً ہی امام احمد سے کہا کہ اگر ہم عراق سے حجاز تک کا سفر صرف اس حدیث

کی توضیح کے لیے ہی کرتے تو بھی ہمارا سفر مبارک وکامیاب ہی تھا تینوں ائمہ نے آپ کی جلالت شان وفہم حدیث کا اعتراف کیا۔

منکرِ حدیث کو جواب

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا مجھ سے جو چاہو پوچھو میں قرآن ہی سے استدلال پیش کروں گا۔ ایک شخص نے پوچھا۔ بھلا یہ تو بتایئے کہ بحالتِ احرام کوئی شخص کسی بھڑ کو مار ڈالے تو قرآن میں اس کا کیا حکم ہے۔ امام صاحب نے فوراً ہی فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا

خدا فرماتا ہے۔ محمد الرسول اللہ تمہیں جس بات کا حکم دیں اس کی تعمیل کرو۔ اور جس سے روکیں اُس سے باز رہو۔ پھر حدیث کی ایک سند پڑھی کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرے بعد تم شیخین یعنی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کرتے رہنا۔ پھر دوسری سند سے روایت بیان کی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بحالتِ احرام بھڑ کو مار دینے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

مفتیِ حرم کا منصبِ جلیلہ

علماء مدینہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو قمری والے واقعہ کے بعد ہی آپ کو ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں فتویٰ دینے کی اجازت دے چکے تھے، واپسی مکہ پر آپ کے اُستاد مکہ مسلم بن خالد زنجی نے بھی آپ کو فتوے دینے کی اجازت دے دی لیکن آپ نے بنظرِ احتیاط حضرت امام سفیان بن عیینہ رحمت اللہ سے جو مثل امام مالک رحمۃ اللہ امام الائمۃ محمد ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ کے شاگرد رشید تھے۔ استفادہ کیا۔ امام سفیان بن عیینہ نے کئی سال تک آپ کو حدیث و فقہ و تفسیر کی تعلیم دی ایک بار انہوں نے آپ سے دریافت کیا۔ شافعی یہ بتاؤ کہ امام زہری کی روایت سے جو یہ حدیث مروی ہے کہ حضور علیہ السلام

حضرت صفیہ ام المومنین کے ساتھ مسجد سے چلے، راستہ میں آپ کو دو آدمی ملے آپ نے اُن سے مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا میرے ساتھ میری بیوی صفیہ ام المومنین ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ شیطان انسان کے رگ و پے میں خون کی طرح پھرتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، امام شافعؒ نے جواب دیا کہ حضور علیہ السلام کے پیش نظر یہ تھا۔ کہ قبل اس کے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خطرات گذریں کہ ایک اولوالعزم نبی کے ساتھ یہ عورت کیسے اور پھر وسوسہ شیطانی ان کے دل میں اتہام یا سوءظنی کو پیدا کرتا۔ آپؐ نے اس تصور سے قبل ہی اس کو واضح کر دیا تاکہ ان کا دماغ سوءظنی میں مبتلا ہی نہ ہو، دوسرے اُمت کے لیے یہ طریقہ تعلیم کا تھا، چنانچہ آپ کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ میں باوجود اس کے کہ نبی ہوں، مگر میرے متعلق بھی لوگ غلط رائے قائم کر سکتے تھے، اس لیے تم لوگ بھی ہمیشہ اس کو پیش نظر رکھو کہ تہمت یا افترا و بہتان کے اسباب سے ہمیشہ خود کو محفوظ رکھو، چونکہ شیطان انسان کے رگ و پے میں دوڑتا پھرتا ہے، حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ نے فرمایا، جزاک اللہ کیا نفیس بات کہی ہے اور ایسے بیان میں کہ جی خوش ہو گیا۔ اب تم فتویٰ دیا کرو۔

امام احمد بن حنبل کی شہادت

آپ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے معاملات اور مسئلے آن واحد میں سلجھا دیتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے زیادہ صحیح الدماغ سریع الفہم اور مسائل کا صحیح اور مدلل جواب دینے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ چنانچہ آپ مکہ مکرمہ میں ۱۹۵ھ تک مفتی رہے۔ پھر بغداد تشریف لائے، ہارون رشید نے آپ کو بلوایا اور فرمایا کہ آج میرے دربار میں جب سب جمع ہوں، وعظ کہیے آپؒ نے وعظ فرمایا، حاضرین مجلس کے تاثرات تو بیان سے باہر ہیں، خود ہارون رشید کا یہ حال تھا۔ کہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ وعظ ختم ہونے پر آپ کو ۵۰ ہزار درہم نذر کیے۔

ربیع و مزنی کہتے ہیں ۵۰ ہزار درہم میں چالیس ہزار علما، زہاد، عباد اور بیوگان و یتامیٰ کو آپ نے تقسیم کر دیئے۔ لوگوں نے کہا۔ آپ نے اس قدر تقسیم فرما دیئے۔ فرمایا خدا فرماتا ہے۔ وفی اموالھم حق للسائل۔ اس لیے ان بیکسوں کے نصیب سے یہ دولت آئی تھی، اور میں نے انہیں کی نذر کر دی۔ خدا نے مجھے ایک واسطہ بنا دیا جس کے ذریعہ سے یہ مال ان تک پہنچ گیا۔ اور میں حشر کے حساب سے ڈر رہا ہوں کہ آیا جو فرض ان کے حقوق کا مجھ پہ عاید فرمایا گیا ہے۔ میں صحیح طور پہ اس کو ادا کر رہا ہوں یا نہیں۔ پھر وہاں سے دو برس کے بعد آپ مکہ مکرمہ واپس تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ میں حج سے فارغ ہو کر ۱۹۸ھ میں آپ پھر بغداد تشریف لائے اور چند مہینہ ٹھہر کر پھر مصر تشریف لے گئے۔ پھر آخر عمر تک آپ نے وہیں قیام فرمایا اور وہیں مرجع خلائق رہے۔

امام شافعی کی فنِ مناظرہ میں دستگاہ

آپ کی ذات چونکہ حجازیوں اور عراقیوں کی فقہ، حدیث اور بدوؤں کی فصاحت کا مجموعہ تھی۔ اس لیے آپ مناظرہ اور خوبی تحریر میں یکتا ہیں ۔ اور آپ کی تحریر جاحظ وغیرہ سے بھی بلند پایہ سمجھی جاتی ہے۔ تمام ائمہ میں تنہا آپ کی ذات ہے کہ جس نے مکہ، مدینہ یمن، نواح یمن، عراق، شام، مصر، الجزائر تک سفر کیے اور ہر ہر جگہ علماء و فضلا سے مذاکرات فرماتے رہے، صرف آپ کی مساعیٔ جمیلہ تھیں، جن کی وجہ سے ان شہروں میں لوگوں نے آپ کے اجتہادی مسائل کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کو ناصر الحدیث، مجدد امام الائمہ مان لیا۔ آپ کے مذاکرات و مناظرات کا بیشتر حصہ تو حصہ دوم میں پیش ہوگا لیکن یہاں چند واقعات پیش ہیں۔

۱۔ یتیم کے مال پر زکوٰۃ

چند لوگ آئے اور امام شافعی کے اس فتوے پر اعتراض کیا کہ "یتیم کے مال پر زکوٰۃ لازم ہے" آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں، حالانکہ قرآن میں خدا نے فرمایا ہے، واقیموا الصلوٰۃ و آتو الزکوٰۃ، یعنی نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، پس یتیم اور نابالغ پر نماز تو لازمی نہیں ہے۔ پھر زکوٰۃ کس طرح فرض ہو جائے گی، نابالغ پر تعزیری جرائم کے پاداش میں حد بھی نہیں دی جاتی اور خدا نہ کرے وہ کافر ہو جائے تو حکم ارتداد بھی نہیں دیا جاسکتا اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے، تین شخص مرفوع القلم ہیں، نابالغ، دیوانہ اور سونے والا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ تمہارا استدلال ہی سرے سے غلط ہے۔ دوسرے تم اپنے استدلال پر عمل کرنے میں خود بھی اس کے خلاف عمل کرتے ہو۔ اب سنو اصل حقیقت شرعی یہ ہے زکوٰۃ مال پر فرض ہے۔ نہ کہ عمر پر جو نصاب شرعی ہے۔ اگر اس کو ایک سال گذر جائے تو پھر اس مال پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔ اور نماز بالغ پر فرض ہے تاکہ اس کو اچھی طرح طہارت و حقیقت نماز سے آگہی ہو جائے۔ تم اپنے اصول سے ہٹ کر جو عمل کرتے ہو وہ بھی سنو۔

اگر کمسنی میں کسی لڑکی کا شوہر مر جائے تو تم مثل بالغہ عورت کے اس کی عدت لازم قرار دیتے ہو۔ تا دان جنایات میں نابالغ مثل بالغ کے قرار دیتے ہو علاوہ ازیں تم نابالغ سے عشر وصول کرتے ہو۔ اور کہتے ہو۔ کہ یہاں احکام مثل بالغ کے ہیں۔ یہ تمہاری فقہی ناسمجھی ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ جب تم کہتے ہو کہ نماز و زکوٰۃ ساتھ ساتھ فرض ہوئی ہیں۔ تو اس مسئلہ میں کیا کہتے ہو۔ جس شخص کے پاس مال نہیں ہے۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ کیا نماز بھی اس سے ساقط ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص سال بھر تک مجنون رہے۔ تو نماز اس سے ساقط ہو جائے گی۔ اگر وہ مالدار ہے۔ تو کیا زکوٰۃ بھی اس سے ساقط ہو جائے گی۔ اگر ایک مالدار سفر کر رہا ہو اور دوران سفر میں اس پر زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت شروع ہو گیا تو سفر میں وہ قصر نماز تو کر سکتا ہے۔ کیا دوران سفر میں وہ زکوٰۃ میں بھی کچھ قصر کر سکتا ہے۔ حائضہ سے نماز ساقط ہے۔ کیا زکوٰۃ بھی ساقط ہے یہ استدلال سن کر وہ متحیر ہوئے اور کہنے لگے۔ کہ ابراہیم نخعی اور ہمارے کوفہ کے فقہا تو یتیم و نابالغ کے مال میں زکوٰۃ کو فرض نہیں سمجھتے۔ امام شافعی نے جواب دیا سبحان اللہ ایک طرف تو امام ابو حنیفہ کا یہ قول ہے۔ کہ تابعی بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔ ہم ان کی مخالفت کرنے کے مجاز ہیں۔ پھر تم لوگ مجھے اپنے فقہائے کوفہ یا تابعین کے اختلاف سے کیوں روکتے ہو۔ حالانکہ حدیث صحیح سے یہی ثابت ہے کہ نابالغ کے

مال میں زکوٰۃ ہے۔ کوفہ کے فقہا نے جواب دیا مگر حضرت عبد اللہ بن مسعود کا فتویٰ بھی آپ کے خلاف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا۔ عبد اللہ بن مسعود کے مقابلہ میں ارشاد حضور انور علیہ السلام لازمی ہے۔ علاوہ ازیں عبد اللہ بن مسعود نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اسے بھی تم غلط سمجھے وہ فرماتے ہیں۔ ولی مال یتیم سے نہ ادا کرے بلکہ یتیم جب بالغ ہو جائے تو وہ حساب کر کے خود ادا کرے۔ علاوہ ازیں عبد اللہ بن مسعود کی روایت جو تم لوگ بیان کرتے ہو اس کا راوی غیر معتبر ہے۔ میں جو کہتا ہوں اس کی دلیل صحیح حدیث ہے۔ اور چار اکابر صحابہ کا فیصلہ ہے جو یہ ہیں۔ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ و حضرت عائشہ صدیقہ۔

۲۔ فقہ ہے یا مذاق؟

ایک دن فقیہہ ربیعہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ سے کہا کہ اگر کوئی شخص رمضان کا ایک روزہ قضا کرے تو اس کو بارہ روزے رکھنے چاہییں۔ چونکہ اس مہینہ کا ایک دن اور مہینوں کے بارہ دن کے برابر ہے۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ یہ فقہ ہے یا مذاق۔ اگر تمہارا یہی نظریہ ہے تو پھر شب قدر کی نماز اگر فوت ہو جائے تو وہ ہزار مہینہ تک قضا کیا کرے۔ چونکہ لیلۃ القدر خیر من الف شہر، قرآن میں ہے۔ ربیعہ خاموش ہو کر چلے گئے۔

۳۔ امام احمد بن حنبل پر اعتراض

امام شافعی رحمۃ اللہ نے ایک بار امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے پوچھا میں نے سنا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ایک وقت نماز چھوڑنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ امام احمد نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ امام شافعی نے فرمایا۔ اگر ایسا کافر مسلمان ہونا چاہیے تو کیا کرے۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ نماز پڑھنے لگے۔ امام شافعی نے کہا کیا تمہارے نزدیک کافر کی نماز صحیح ہوگی۔ یا صحت نماز کے لیے پہلے اسلام شرط ہے۔

۴- ایک مناظرہ کی کیفیت

فضل بن ربیع نے ایک مرتبہ امام شافعی سے عرض کیا کہ میں حسن بن زیاد لولوی سے آپ کا مباحثہ سننا چاہتا ہوں۔ امام شافعی نے فرمایا۔ حسن بن زیاد مباحثہ کے قابل ہے کب۔ اگر تم اصرار کرتے ہو تو اپنے کسی شاگرد سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہارے سامنے اس سے مباحثہ کر لے گا۔ حسن بن زیاد بلوائے گئے امام شافعی کے شاگرد نے کہا۔ حضرت اہل مدینہ ہمارے اصحاب کوفہ پر چند اعتراض کرتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں حسن نے کہا بے تکلف کہو۔ اس شخص نے کہا مسئلہ یہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص بحالت نماز پاک دامن عورت پر تہمت لگائے تو کیا حکم ہے۔ حسن نے کہا نماز باطل ہو جائے گی۔ اس شخص نے کہا اور وضو حسن نے کہا وضو قائم رہے گا۔ اس شخص نے کہا اگر کسی شخص نے نماز میں قہقہہ لگایا تو کیا حکم ہے۔ حسن نے کہا نماز اور وضو دونوں باطل ہو گئے۔ اس شخص نے کہا پاک دامن عورت پر تہمت لگانا۔ قہقہہ سے کیا کم تر ہے۔ فضل بن ربیع بے اختیار ہنس پڑا۔ امام شافعی سے جب تذکرہ ہوا تو فرمانے لگے میں پہلے کہتا تھا کہ حسن بن زیاد گفتگو کے قابل ہی نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حسن بن زیاد لولوی کو تمام محدثین ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں۔ اور فن حدیث میں ان سے روایت نہیں کی جاتی۔ بدیں وجہ امام شافعی رحمۃ اللہ نے بذات خود ان سے مخاطبت پسند نہیں فرمائی۔

۵- امام محمد پر ایک اعتراض

ایک دن امام شافعی رحمۃ اللہ نے امام محمد علیہ الرحمۃ سے فرمایا۔ کنوئیں کی طہارت کے متعلق آپ حضرات کا عجیب حیرت ناک مسلک ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک چوہا کنوئیں میں گر کر مر جائے تو اس کنوئیں کا پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ تا آنکہ اس سے بیس ڈول پانی نہ نکال دیا جائے یہ آپ لوگوں کا فتویٰ خلاف قیاس جلی ہے کہ کل شئے ناپاک ہو اور جب اس میں سے کچھ حصہ خارج کر دیا جائے تو باقی پاک ہو جائے علاوہ ازیں آپ حضرات کا یہ قول اور بھی

تعجب خیز ہے۔ کہ اگر کوئی بقصد وضو کنوئیں میں ہاتھ ڈال دے تو کل کنوآں ناپاک ہو جاتا ہے۔ تا آنکہ کل کنواں خالی نہ کیا جائے۔ اگر مردار یا نجاست گر جائے تو ۲۰ ڈول یا ۳۰ ڈول پانی نکال دینے سے کنوآں پاک ہو جاتا ہے۔ مگر ہاتھ ڈالنے سے تو قیامت آ جاتی ہے۔ بھلا آپ یہ تو بتائیے کہ کیا یہ مسائل عقل سلیم کے مطابق ہیں۔

۶۔ قول رسولؐ سے استدلال

امام اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں۔ میں، یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل مکہ میں ساتھ ہی گئے اور ساتھ ہی ایک جگہ رہتے تھے۔ امام احمد کا تو یہ معمول تھا۔ کہ وہ اپنا اکثر وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں صرف کرتے رہتے اور میں امام احمد کی صحبت و یکجائی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ ایک دن امام احمد نے مجھ سے فرمایا اے ابو یعقوب تم امام شافعی کی مجلس میں میرے ساتھ کیوں نہیں چلا کرتے میں نے کہا جب یہاں امام شافعی کے شیوخ موجود ہیں جیسے سفیان بن عیینہ تو پھر ان کو چھوڑ کر ایسے شخص کے پاس جو عمر میں بھی ہم سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ آپ کیوں لے چلتے ہیں۔ امام احمد نے فرمایا خدا تمہیں نیک توفیق عطا فرمائے۔ بھائی شافعی کا علم پھر کہاں حاصل ہوگا۔ بالآخر ان کے فرمانے سے میں ان کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اور دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر میں نے کہا کہ مکہ مکرمہ کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ امام شافعی مخاطب ہوئے میں نے ان پر بھی چند اعتراض کیئے۔ جب میں خاموش ہوا تو شافعی نے مجھ سے فرمایا۔ کیا تم مجھ سے مناظرہ کرنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔

امام شافعی نے فرمایا۔ سنو! خدا فرماتا ہے "للفقرا الذین اخرجو من دیارہم" یعنی ان بیکسوں کے لیے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ اس آیت میں خدا نے مکہ کے مہاجرین کو ان کے گھروں کا مالک بیان فرمایا ہے۔ پس اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ والے اپنے گھروں کے مالک

ہیں اور بغیر کرایہ کے کسی کو تصرف کا حق نہیں ہے۔ مالک کو حق بیع حاصل ہے اور حضور علیہ السلام نے فتح مکّہ کے دِن فرمایا تھا۔ من اغلق بابہٗ فھو آمن ومن دخل دار ابوسفیان فھو آمنٌ جو اپنا دروازہ بند کرلے اس کو امن حاصل ہے۔ اور جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے اُس کو امن حاصل ہے۔ اب غور کرو کہ حضور علیہ علیہ السلام نے مکہ والوں کو ان کے گھروں کا مالک ظاہر فرمایا ہے۔ اور سنو جب حضور علیہ السلام مدینہ منورہ سے مکہ تشریف لائے۔ تو کسی شخص نے آپ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ مکہ مکرمہ میں کہاں ٹھہریں گے۔ آپ نے فرمایا "ہل ترک لنا عقیل دارًا عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑے۔ (سب بیچ دیے) اب بتاؤ۔ امام اسحٰق نے جواب دیا۔ مگر عطا، حسن ابراہیم اور مجاہد وغیرہم تابعین نے تو مکہ کے مکانوں کا بلا معاوضہ استعمال مباح قرار دیا۔ امام شافعی نے حاضرین سے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اسحٰق بن راہویہ فرمایا تم وہی اسحٰق ہو۔ جنہیں خراسان والے فقیہہ کہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں امام شافعی نے فرمایا۔ کاش تمہارے سوا اور کوئی ہوتا تو میں اس کے کان کھنچواتا۔ میں کہتا ہوں کہ حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا۔ اور تم کہتے ہو کہ عطا و طاؤس وغیرہم نے یہ کہا۔ حضور علیہ السلام کے ارشاد گرامی کے سامنے ان کے اقوال کی کیا حقیقت ہے امام اسحٰق نے پھر سوچ کر جواب دیا کہ اچھا ان کے اقوال جانے دیجئے۔ قرآن کی اس آیت کا مطلب کیا ہے۔ سَوَاءً ن العاکِفُ فیہ والباد یعنی اس میں مقیم اور مسافر دونوں برابر ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا۔ بھائی یہ حکم خاص مسجد الحرام کے متعلق ہے۔ امام اسحٰق یہ سن کر خاموش ہوئے اور پھر آپ کے فضل و کمال و تبحر کے معترف اور آپ کی مجلس میں حاضر باش رہے۔

۵ - **ایک اور بحث** امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ تھا کہ اگر کوئی مسلم غلام کسی

کافر کو امن دے دے تو وہ امن قابل اعتبار ہے ۔ اس پر آپ دو دلیلیں بیان فرمایا کرتے تھے ۔ ایک تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمانوں کا ذمہ ایک ہی ہے ۔ ان میں کوئی ادنیٰ شخص بھی کسی کو امن دے دے تو تمام مسلمانوں کو اس کی تعمیل کرنی چاہیئے ۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر غلام مسلمان کو ادنےٰ مسلمان ہی سمجھ لیا جائے تو یہ حدیث کافی ہے ۔ دوسرے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مسلم غلام نے کافروں کو امن دے دیا تھا ۔ تو آپؓ نے اس غلام کے قول کے مطابق امن کو بحال رکھا ۔ اس پر ایک حنفی فقیہہ نے آپ پر اعتراض کیا کہ غلام کا خون آزاد کے خون کے برابر نہیں ہوتا ۔ امام شافعی نے فرمایا ۔ تمہاری زبان سے یہ بات اس لیے پسندیدہ نہیں ۔ کہ تم غلام کے بدلے آزاد کا قصاص روا رکھتے ہو ۔

اس مناظرہ سے اس کا اندازہ ہو جائے گا ۔ کہ دوسری صدی ہجری میں فقہی مسائل میں موشگافیاں کس طرح پیدا ہوئیں ۔ اور غیر موقوعہ مسائل اور ان کے جوابات پر کس قدر دماغ سوزی کی گئی ۔ ایک دن امام محمد رحمۃ اللہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ سے فرمایا یہ اطلاع صحیح ہے ۔ امام محمد علیہ الرحمۃ نے کہا ، میں ان مسائل میں تم سے مناظرہ کرنا چاہتا ہوں ۔ امام شافعی نے فرمایا ۔ بسم اللہ ۔ شروع کیجیئے امام محمد نے کہا ۔ فرض کرو اگر ایک شخص نے کسی کا شہتیر غصب کر کے اپنے مکان میں لگا لیا اور اس کی تعمیر پر کئی ہزار درہم خرچ کر ڈالے ۔ پھر اُس غصب کردہ شہتیر کا مالک آیا اور اس نے گواہوں کے ذریعے ثابت کر دیا کہ یہ شہتیر اس کی ملک ہے اور غاصب نے غصب کر کے لگا لیا ہے ، تو ایسی صورت میں تم کیا فتوٰی دو گے ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا ۔ شہتیر کے مالک کو ہر ممکن کوشش سے راضی کر کے اُس کی قیمت دلوا دی جائے ۔ لیکن اگر وہ اس پر کسی طرح راضی نہ ہو تو بدرجہ مجبوری بحکمت اُس شہتیر کو نکال کر اس کے حوالے کر دیا جائے ۔ پھر امام محمد نے دریافت کیا ۔ اگر کسی شخص نے ایک لکڑی کا

تختہ غصب کر کے اپنی کشتی میں لگالیا اور جب کشتی وسط دریا میں پہنچی تو تختہ کا مالک آگیا اور اپنی ملکیت کا ثبوت پیش کیا۔ اس صورت میں کیا تم اس کشتی سے تختہ نکلوا کر مالک کے حوالے کرو گے، امام شافعی نے فرمایا نہیں، اس جواب پہ امام محمد اور ان کے شاگرد بیحد خوش ہوئے اور ہنس کر کہنے لگے کہ اب تمہارے پہلے قول اور اس قول میں تو بڑا اختلاف ہے، اچھا، دوسرا مسئلہ بتاؤ۔

فرض کرو کہ ایک شخص نے ریشم کے تاگے چرائے اور اپنا پیٹ چاک کرا کے اس سے اپنے زخم کے ٹانکے لگوائے تو اس شخص کے متعلق تمہارا کیا فتویٰ ہے، امام شافعی نے فرمایا کہ اس کا پیٹ چاک نہیں کرایا جاسکتا، چونکہ وہ تاگے اُس حالت میں نہ رہے، اور نہ اس کو اذیت پہنچائی جائے گی، اس پہ امام محمد اور ان کے ساتھی اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور کہنے لگے، تم اپنے قول پر قائم نہ رہ سکے، امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا، ذرا صبر و سکون سے میرا جواب سنیے، آپ یہ بتائیے کہ اگر وہ دھاگہ اس کا اپنی ملک ہوتا تو اس صورت میں اسے اپنے پیٹ سے اس کا علیحدہ کرنا حرام تھا، پھر امام شافعی نے فرمایا کہ جو تختہ کشتی میں لگایا گیا تھا۔ اگر کشتی کے مالک کا خود اپنا ہی ہوتا تو کیا وسط دریا میں اس کا تختہ کا نکالنا جائز تھا۔ یا حرام، امام محمد نے فرمایا، حرام پھر امام شافعی نے فرمایا۔ اب بتائیے کہ مالک مکان اپنی کسی ضرورت کی بنا پہ اپنے مکان کو گرا کر بنانا چاہے، تو یہ جائز ہے یا ناجائز، امام محمد نے فرمایا، جائز ہے، پھر امام شافعی نے فرمایا کہ آپ امر مباح کو حرام کیوں قیاس کرتے ہیں، امام محمد نے فرمایا تو پھر کشتی والے مسئلہ میں تمہارا کیا خیال ہے، امام شافعی نے جواب دیا کہ پہلے کشتی وسط دریا سے کنارے پہ لائی جائے اور مالک تختہ کو قیمت لینے پہ راضی کیا جائے، اگر وہ راضی نہ ہو سکے، تو پھر اس کا تختہ نکال کر اس کو واپس کر دیا جائے، امام محمد نے کہا، حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے، لاضرر ولاضرار یعنی کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے

امام شافعی نے جواب دیا کہ اُس نے تو خود ہی اپنے کو نقصان پہنچایا ہے۔ پھر امام شافعی رحمۃ اللہ نے امام محمد علیہ الرحمۃ سے دریافت کیا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔

ایک شریف خاندانی شخص نے ایک حبشی کی لونڈی غصب کر کے اُس سے جماع کیا اور اس لونڈی سے کئی لڑکے فصیح و بلیغ پیدا ہو گئے۔ عرصہ دراز کے بعد اُس حبشی نے ثبوت پیش کیا کہ لونڈی تو میری ہے۔ اس میں آپ کیا فیصلہ کریں گے۔ امام محمد نے فرمایا کہ وہ لڑکے اس حبشی کی ملک قرار دیئے جائیں گے۔ تب امام شافعی نے امام محمد سے کہا میں آپ کو خدا کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں۔ کہ ان دونوں میں سے کس میں زیادہ ضرر ہے آیا کشتی کے تختہ اکھاڑنے میں یا اُن لڑکوں کے غلام بنانے میں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ چپ ہو گئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

غیر موقوعہ مسائل اور مفروضہ صورتوں سے بے حد احتیاط کرنی چاہیئے۔ چونکہ یہ صحابۂ کرام کی روش نہ تھی جو صورتیں پیش آجائیں۔ ان میں غور تدبر تفکر سبھی کچھ کرنا چاہیئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کا فتویٰ یہ تھا کہ مہر کی کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ نہ اس کی کوئی تحدید ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے لوہے کی انگوٹھی پر بھی نکاح جائز رکھا ہے اور حضرت اُم سلیم نے حضرت طلحہؓ سے صرف اسلام لے آنے پر نکاح کیا تھا۔ اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ متعاقدین جس بات پر رضامند ہو جائیں۔ وہی مقدار مہر کی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ بعض فقیہوں نے جب آپ سے مباحثہ کرنا چاہا تو آپ نے

مباحثہ کے حدود کو محدود فرما کر یہ ارشاد فرمایا۔ صرف حضور علیہ السلام کے ارشاد سے اس کے خلاف ثابت کرو۔ چنانچہ وہ حضرات اس سے قاصر رہے۔

امام شافعی اور امام ابویوسف

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل مدینہ قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ میں اُلجھ رہے تھے۔ کہ مدعی کی قسم اور ایک گواہ پر فیصلہ ہونا چاہیے قاضی

ابو یوسف نے فرمایا میں تو اس کو اس لیے نامناسب سمجھتا ہوں کہ خدا نے فرمایا ہے استشھدوا شھیدین من رجالکم۔ یعنی اپنے میں سے دو گواہ لاؤ۔ ایک شخص نے پوچھا وہ دو گواہ کیسے ہیں قاضی صاحب نے جواب دیا کہ دو عادل مسلمان، اہل مدینہ چپ ہو گئے۔ میں نے آہستہ سے اُن سے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ سے یہ سوال کریں کہ حقوق کے بارے میں آپ لوگوں نے ذمیوں کی شہادت کیوں جائز قرار دی ہے۔ اور یہاں آپ دو عادل مسلمان کی شرط کیوں عائد کر رہے ہیں۔ تو پھر آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے۔ یہ سُن کر قاضی ابو یوسف نے کچھ دیر تک سر جھکا کر سوچا پھر مجھ سے مسکرا کر کہنے لگے کہ ان لوگوں کی ذہانت یہاں تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ شخص صرف بے علموں پر ہی غالب آسکتا ہے امام محمد، امام ابو یوسف و دیگر فقہائے عراق وغیرہم بحث و مناظرہ میں امام شافعی کے حریف تھے۔ لیکن یہ تمام فقہا آپ کی عظمت و جلالت شان کا بحد لحاظ فرماتے تھے۔

امام محمد اور امام شافعی

امام محمد رحمۃ اللہ ایک دن ہارون رشید کے دربار میں جا رہے تھے۔ راستہ میں امام شافعی رح ملے۔ امام محمد علیہ الرحمۃ فوراً اپنے گھوڑے سے اُتر پڑے اور خادم سے کہا کہ بارگاہِ خلافت میں جا کر اطلاع کر دو۔ کہ چونکہ امام شافعی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں حاضر نہیں ہو سکتا امام نے فرمایا۔ آپ تو تشریف لے جایئے میں پھر آجاؤں گا امام محمد علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ وہاں جانا اس قدر ضروری نہیں۔ جتنا کہ آپ کی تشریف آوری سے استفادہ ہے۔

امام شافعی کی شکل وشباہت اولاد وازواج

حلیہ

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، آپ میانہ قد، موزوں اندام تھے، ہاتھ بہت لمبے تھے، آپ کے شاگرد کہتے ہیں کہ گھٹنوں تک ہاتھ پہنچتے تھے، کشادہ پیشانی، چہرہ زیادہ پُر گوشت نہ تھا، تبسم ہمیشہ نمایاں رہتا، بھنویں بھری ہوئی مگر علیحدہ علیحدہ، دانت چھوٹے مگر کشادہ، ڈاڑھی متوسط، آخر عمر میں مہندی کا خضاب لگاتے تھے، ناک لمبی اور اس پر ہلکے ہلکے چیچک کے نشان، چہرہ پر وقار نمایاں تھا۔

ازواج واولاد

ان کی ایک اہلیہ اور ایک جاریہ تھی، آپ کی اہلیہ حمدہ حضرت عثمان کے خاندان سے تھیں، ان کا نسب یہ ہے حمدہ بنت نافع بن عنیبہ بن عمر بن عثمان، بن عفان، آپ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، دو کا بچپن میں انتقال ہو گیا، حضرت ابو عثمان محمد رہے، لڑکیوں کا نام فاطمہ و زینب تھا۔ اہل وعیال سے بڑے خوشگوار تعلقات تھے، آپ کے مصارف ذی وسعت افراد کی طرح تھے، کبھی خانگی معاملات میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔[1]

تذکرہ ابو عثمان خلف اکبر حضرت امام شافعی

نام محمد، کنیت، ابو عثمان محمد بن محمد ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع، جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو یہ مکہ میں مقیم تھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کے یہ شاگرد خاص ہیں، وہ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ میں تین

---

[1] طبقات الشافعیۃ، کبریٰ